سلسلۂ مطبوعات مجلس
۱۸۳

دینِ اسلام اور اوّلین مسلمانوں
کی
دو متضاد تصویریں

(عقائدِ اہلِ سنّت و عقائدِ فرقۂ اثنا عشریہ کا تقابلی مطالعہ)

سیّد المرسلین خاتم النبیّین (صلے اللہ علیہ وسلم) کے علوِّ شان، بعثتِ عظمیٰ کے مقاصد و نتائج، انسان کی فطری صلاحیت و اصلاح پذیری کی رُو سے اور غیر جانب دار تاریخ کی شہادت کی روشنی میں کون سی تصویر (اصلاحی و تربیتی کام کرنے والوں کے لئے) حوصلہ افزا و ہمّت آفریں اور ایک صاحبِ انصاف کے لئے قابلِ قبول اور مطابقِ واقعہ ہے؟

مولانا سیّد ابو الحسن علی حسنی ندوی

مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام لکھنؤ

بارِ دوم

۱۴۰۶ھ ــــ ۱۹۸۶ء

دوسرا ایڈیشن اہم اضافوں اور ترمیمات کے ساتھ

کتابت ــــــــــــ ظہیر احمد کاکوروی

طباعت ــــــــــــ لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس (آفسٹ)

صفحات ــــــــــــ ۱۱۲

قیمت ــــــــــــ

باہتمام

محمد غیاث الدین ندوی

طابع وناشر

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

(ندوۃ العلماء)

دینِ اسلام اور اوّلین مسلمانوں کی

دو متضاد تصویریں

۱۴۰۶ھ - ۱۹۸۵ء

۱۔ اردو	دوسرا ایڈیشن	لکھنؤ۔ کراچی
۲۔ عربی	" "	" کویت و قاہرہ
۳۔ انگریزی	پہلا "	" (زیرِ طبع)
۴۔ فارسی	" "	" "

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِہِمْ یَقُوْلُوْنَ
رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا
بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝ (الحشر۔ ۱۰)

فہرست عناوین

"دینِ اسلام اور اوّلین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ وحدہ والصلاۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہ

زیرِ نظر کتاب کسی مخصوص دینی مسلک، نظامِ عقائد، یا مکتبِ فکر کے اثبات و احقاق، اور اس کے مخالف مسلک، عقیدہ یا فرقہ و جماعت کی تنقید و تردید کی کوئی متکلمانہ و مناظرانہ کتاب نہیں ہے، جو لوگ اس نظر سے اس کتاب کو پڑھیں گے اندیشہ ہے کہ ان کو مایوسی ہوگی، اس موضوع پر مختلف اسلامی زبانوں (بالخصوص عربی، فارسی، اردو میں) ایک وسیع و وقیع کتاب خانہ موجود ہے، جس کا سرسری جائزہ لینا بھی آسان نہیں۔

اس کتاب میں اولین مسلمانوں اور تاریخِ اسلام کے مثالی و معیاری عہد (عہدِ رسالتؐ و عہدِ صحابہؓ) میں اسلامی تعلیمات کے اثرات اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوتی و تربیتی مساعی کے نتائج کا ایک ہلکا سا نقشہ پیش کیا گیا ہے، دنیا کے دوسرے داعیوں، مربیوں اور مصلحین سے آپؐ کا امتیاز دکھایا گیا ہے، پہلے اسلامی معاشرہ کی (جس کا وجود تنہا آپؐ کی دعوت و تربیت سے عمل میں آیا) معتبر تاریخ کی روشنی میں صورتِ حال سامنے رکھی گئی، آپؐ کے لائے ہوئے صحیفہ کی (جو خدا کی آخری کتاب اور انسانیت کے لئے دائمی دستورِ حیات ہے) صحت و حفاظت کے غیبی و الٰہی انتظام کو واضح کیا گیا ہے، بانیانِ سلطنت اور داعیانِ انقلاب کا اپنے خاندانوں کے بارے میں قدیم زمانہ سے جو طرزِ عمل رہا ہے، پیغمبرِ انسانیتؑ کے طرزِ عمل کا اس سے بنیادی اختلاف دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، اور اس نقطۂ نظر سے

خود خاندانِ نبوت کے رویّہ اور اس کے اخلاق کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

ظہورِ اسلام سے قیامِ قیامت تک نبی کی "وحدت" و "خاتمیت" اور اس کے تنہا شارع و مُطاع ہونے کے بارے میں امّت کے عقیدہ اور اس کی اہمیت وضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پھر اہلِ سنت کے اس اجماعی عقیدہ اور تسلسل و تواتر کے ساتھ فہمِ دین، حیاتِ نبوی، عہدِ صحابہ اور تاریخِ اسلام کی اس تعبیر و تصویر کے بالکل متوازی فرقۂ امامیہ اثنا عشریہ اپنے اوّلین بانی سے لے کر علّامہ خمینی تک) جو نقطۂ نظر رکھتا ہے، اور اس نے اس کو اپنے عقیدہ و عمل کی اَساس اور اپنے فرقہ وجماعت کا شعار بنایا ہے، اس کو خود اسی کے مستند نمائندوں، دینی پیشواؤں اور ان کی معتبر و مسلّم تصنیفات اور کتابوں کے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے، اور اس کا فیصلہ فطرتِ سلیم، ذوقِ صحیح اور عقلِ عام پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ ان میں سے کون سی تعبیر و تصویر ایک ایسے پیغمبر کے شایانِ شان ہے جو قرآن کے اعلان، اپنے یگانہ کمالاتِ نبوت کے تقاضہ و نتیجہ، اور مسلم و غیر مسلم مؤرخین کے متفقہ بیان اور واقعات کی شہادت کے مطابق سب سے کامیاب پیغمبر اور تاریخِ انسانی کا سب سے بڑا ہادی، مُربّی و مصلح گزرا ہے، اور پھر اس دین کے شایانِ شان ہے، جو ہر دور اور ہر نسل میں انسانوں کو ہدایت و سعادت، محبت و اُلفت، ایثار و قربانی، اور انقلابِ حال کا پیغام دیتا ہے، اور ان کو حیوانیت کی آخری پستی سے اٹھا کر انسانیت کی آخری بلندی تک پہنچانے کی ذمہ داری لیتا ہے، اخیر میں مصنّف قارئین کے قلبِ سلیم سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوتا ہے! ع

خود تو منصف باش اے دل این نکو یا آن نکو؟

ابوالحسن علی ندوی
مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ

۱۹ صفر المظفر ۱۴۰۵ھ
۱۴ نومبر ۱۹۸۴ء

دیباچہ طبع دُوم

خدا کا شکر ہے کہ ایک سال سے بھی قلیل عرصہ میں پیش نظر کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کی نوبت آرہی ہے، جہاں تک اس کے عربی، انگریزی ترجموں کا تعلق ہے، ان کی اس سے زیادہ وسیع پیمانے پر اشاعت ہوئی، عربی کے دُو سے زائد ایڈیشن بلاد عربیہ میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں[1]، انگریزی ایڈیشن کی انگریزی بولنے والے ممالک بالخصوص جنوبی افریقہ میں وسیع اشاعت ہوئی، ان سطور کے لکھنے کے وقت تک امید ہے کہ اس کا ایک یا ایک سے زائد ایڈیشن وہاں نکل چکے ہوں گے۔

چوں کہ عربی، انگریزی ترجمہ کی نوبت اصل اُردو کتاب کی طباعت کے بعد آئی تھی، اور اس عرصہ میں مصنّف کا مطالعہ، تلاش و جستجو جاری تھی، اس زمانہ میں بلاد عربیہ کا بھی سفر پیش آیا، جہاں کچھ نئے ماخذوں تک رسائی ہوئی،

[1] مطبوعۂ دار البشیر عمان (اردن) و مکتبۃ الصحوۃ قاہرہ۔ مصر

اور بعض قدیم کتابیں جو نایاب تھیں، مطبوعہ شکل میں نظر آئیں، اس لئے کتاب میں متعدد مفید اور قیمتی اضافے کئے گئے، خصوصیت کے ساتھ خلفائے ثلاثہؓ کے بارے میں غیر مسلم ۔ مؤرخین و محققین کی بعض وقیع شہادتیں اور اس سے بڑھ کر حضرات اہلِ بیت رضوان اللہ علیہم کے طرز زندگی، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ان کے ساتھ رویّہ اور طرزِ عمل اور بزرگان اہلِ بیت کے مزاج و مذاق اور اخلاق و شمائل کے بارے میں بعض نہایت مؤثّر و فکر انگیز واقعات سامنے آئے، جن کو عربی، انگریزی ترجمہ میں شامل کیا گیا، اب جب کہ اصل اُردو کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت آرہی ہے ان کو کتاب میں شامل کرکے اس کی افادیت اور قیمت میں اضافہ کیا جاتا ہے۔

یہاں پر ایک حقیقت کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے، جس سے شاید بعض طبیعتوں میں مصنّف کے اپنے بارے میں خودستائی کا پہلو نکلتا ہو، لیکن ایک امرِ حق سمجھ کر اس کا اظہار کیا جاتا ہے کہ کتاب اگرچہ ایک نزاعی مسئلہ پر لکھی گئی ہے، اور ایک ایسی ضرورت کی تکمیل کے لئے وجود میں آئی ہے، جس کو خاص اسباب و حالات اور ایک خاص دعوت و تحریک کے جارحانہ اور مُدّعیانہ طرزِ عمل نے اور اس سے پیدا ہونے والے سنگین نتائج نے ناگزیر بنادیا اور مصنّف کو اس موضوع پر قلم اٹھانے اور علمی اور تاریخی انداز میں اس کا محاسبہ و محاکمہ کرنے پر مجبور کر دیا، لیکن اس سلبی و دفاعی پہلو سے قطع نظر (جو اس کتاب میں ضمناً و اضطراراً آگیا ہے) یہ کتاب اپنے علمی، تاریخی نفسیاتی حقائق، قرآن و سیرت کو واقعات اور عقلِ سلیم کی روشنی میں پیش کرنے،

کارنامۂ نبوت اور اس کے عہدِ سعادت و برکت کی ایسی روشن، ہمت آفریں اور ولولہ انگیز تصویر پیش کرنے کی بناء پر جو تاریخی طور پر ناقابلِ انکار ہے، وہ سیرت اور جدید علم کلام کی ایک جدید الاسلوب اور فکر انگیز کتاب بن گئی ہے، جو کسی فرقہ و مذہب کے بھی سلیم الطبع اور انصاف پسند آدمی کو پڑھنے کے لئے دی جاسکتی ہے، اور ہمیں امید ہے کہ اگر تعصّبات سے الگ رہ کر اور تھوڑی دیر کے لئے تلاشِ حق کے جذبہ سے اس کو خود فرقۂ اثنا عشریہ... کے تعلیم یافتہ نوجوان پڑھیں گے اور اللہ تعالےٰ کی توفیق و رہنمائی شاملِ حال ہوگی تو وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہیں گے۔

اسی کے ساتھ ان اہلِ سنّت والجماعت، تعلیم یافتہ نوجوانوں سے بھی امید ہے (جو کسی وجہ سے سیرت اور اسلام کے ابتدائی عہد کی تاریخ، دورِ صحابہ کی روداد اور خلافت راشدہ کے موضوع پر لکھی ہوئی ضخیم کتابیں، جن میں اکثر عربی اور فارسی میں ہیں نہیں پڑھ سکتے) وہ اس مختصر کتاب کو پڑھ کر اپنے عقیدہ میں پختگی، ایمان میں تازگی و قوت، صحابۂ کرام کی عظمت و عقیدت کے ساتھ اہلِ بیت کرام کی محبت و وقعت میں اضافہ محسوس کریں گے، اسی کے ساتھ ان کے اندر فطرتِ انسانی کی حق پذیری و سلامت روی کی صلاحیت، خلوص و قربانی پر مبنی جدّ و جہد کی کامیابیوں پر نیا اعتماد اور انسانیت کے ماضی، حال و مستقبل سے مایوسی کے بجائے ان میں حوصلہ و ولولہ پیدا ہوگا، اور یہ یافتہ صلاحیت ان کو نئے نئے میدانوں میں جدو جہد، معاصر دنیا اور قوموں کے سامنے دعوتِ اسلام، سیرت نبویؐ اور پیغام محمدیؐ

پیش کرنے کی جرأت وشوق پیدا کرے گی، اور خود اپنے بارہ میں اصلاحِ حال اور اخلاقی ترقی پر آمادہ کرے گی۔

وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

ابوالحسن علی ندوی

۱۵ محرم الحرام ۱۴۰۶ھ
یکم اکتوبر ۱۹۸۵ء

دینِ اسلام اور اوّلین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں

عقائدِ اہلِ سنت و عقائدِ فرقۂ اثنا عشریہ کا تقابلی مطالعہ

عالمگیر اور دائمی دین کے لئے (جو اصلاحِ انسانیت و انقلابِ عالم کا علمبردار ہو) چار شرطیں

عقلِ سلیم کا فیصلہ، فطرتِ انسانی، مذاہب و ادیان کی تاریخ کا وسیع اور مبصرانہ مطالعہ اقوام و ملل اور افرادِ انسانی کی نفسیات سے گہری واقفیت نیز تاریخِ انسانی کی ان انقلابی و اصلاحی کوششوں اور تحریکوں کے نتائج کا بے لاگ جائزہ جن کی تاریخ محفوظ و معلوم ہے، سب اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں کہ ایک ایسے دین کے لئے چار صفات و خصوصیات کا حامل و جامع ہونا ضروری ہے، جو پوری نوعِ انسانی کو مخاطب کرتا اور اس کو صحیح اعتقاد و عمل، اعلیٰ اخلاق و کردار، بنیادی اصلاح و انقلاب کی دعوت دیتا ہو اور تمدن و معاشرۂ انسانی کی نئی تنظیم و تشکیل کا داعی اور مدعی ہو، وہ خدا کا آخری دین اور پیغام ہو، جس کو قیامت تک باقی رہنا ہو اور انسانوں کی تربیت و تعلیم کا فرض انجام دینا ہو، اور وہ کسی زمانہ اور مقام کے ساتھ مخصوص نہ ہو۔

عُرفی و رواجی طریقوں اور وسائل کے بغیر معجزانہ آدم گری و مردم سازی

۱۔ اس دین کے داعیِ اوّل اور پیغمبر کی تعلیم و تربیت اور صحبت میں ایسی تاثیر،

انقلاب انگیزی اور قلب ماہیت کی طاقت اور ایسی آدم گری و مردم سازی کی شان ہو کہ اس کے سامنے "پارس" اور "کیمیا" کی اعجوبہ گری کا ذکر اس کی شانِ تاثیر کی توہین اور تاریخی حقائق سے ناواقفیت کی دلیل ہو، پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی اس انقلاب انگیزی اور تبدیلی حال میں ان وسائل اور طریقوں کا محتاج نہ ہو جن سے دنیا کے دانشور، معلّمینِ اخلاق، ماہرینِ تعلیم، سیاسی قائدین، تعلیمی و تربیتی ادارے اور ذہین و دانشمند حکومتیں کام لیتی ہیں، مثلاً علوم و فنون کی ترتیب و تدوین، مؤثر کتابیں اور سحر انگیز خطبات، مطالعہ اور دعوتِ فکر، ادب و شاعری، حقائق و معانی کی تمثیل و تجسیم، انعامات، عہدے اور مراتب وغیرہ وغیرہ، نیز ان دانشوروں، معلّمین، قائدین اور اس پیغمبر کی تربیت و صحبت میں (جو اپنی دوسری بے سروسامانیوں اور مکان و زمان کی منفرد مشکلات کے ساتھ کتابی علم سے یکسر ناآشنا بلکہ حرف ناشناس، اُمّی محض بھی ہے) ایسا فرق نظر آتا ہو جس سے صاف ظاہر ہوتا ہو کہ وہ تاثیر یہ تاثیر، وہ انقلاب و تبدیلی اور یہ انقلاب و تبدیلی، دو علیحدہ اور ممیز جنس کی چیزیں ہیں، اور دونوں کا سرچشمہ بالکل الگ ہے، پیغمبر کی انقلاب انگیزی اور کردار سازی میں ارادۂ الٰہی، غیبی تائید اور ایک ایسا فرق دیکھنے والوں کو صاف نظر آتا ہے جس کو "نورِ نبوت" اور "برکتِ صحبت" کے علاوہ کسی اور لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، پیغمبر کے تربیت کردہ و صحبت یافتہ لوگوں میں تعلّق مع اللہ، اخلاص، عبودیت و تواضع، ایثار و بے نفسی، ذوقِ عبادت، تحقیرِ دنیا، فکرِ آخرت، احتسابِ نفس اور استقامت کی وہ شان پائی جاتی ہے، جو فلاسفہ، دانشوروں، ماہرینِ تعلیم اور معلّمینِ اخلاق کے تیار کیے ہوئے لوگوں میں عنقا ہے۔

اس پیغمبرانہ تربیت و تاثیر اور انقلاب انگیزی کی قرآن مجید کی اس آیت میں پوری تصویر کھینچ دی گئی ہے، جو قرآن مجید میں کئی جگہ تھوڑے فرق کے ساتھ آئی ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ (سورۃ الجمعۃ ۔ ۲)

وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انھیں میں سے (محمدؐ) پیغمبر بنا کر بھیجا، جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے، اور انھیں (خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں، اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

نیز آیتِ قرآنی :-

وَلَٰكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ ۚ (سورۃ الحجرات ۔ ۷)

لیکن خدا نے تم کو ایمان عزیز بنا دیا اور اس کو تمہارے دلوں میں سجا دیا، اور کفر اور گناہ اور نافرمانی سے تم کو بیزار کر دیا۔

اسی طرح آیتِ قرآنی :-

فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا ۚ[1] (سورۃ الفتح ۔ ۲۶)

اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی اور ان کو پرہیزگاری کی بات پر قائم رکھا، اور وہ اسی کے مستحق اور اہل تھے۔

---

[1] صحابۂ کرامؓ کے بارے میں قرآن مجید کی شہادتوں اور ان کے اُن فضائل کے لئے جو نصِ قرآنی سے ثابت ہیں ملاحظہ ہو آیاتِ بیّنات حصۂ اول ص ۱۲ ۔ ۳۱

خود پیغمبر کی زندگی میں دعوت کی کامیابی اس کے متبعین کی تبدیلئ حال و استقامت ضروری ہے

پیغمبر کی زندگی میں ہدایت وتاثیر کی یہ اعجاز نمائی، اعتقادی واخلاقی انقلاب انگیزی اور بڑی تعداد میں ایسے چلتے پھرتے دنیا کا کام کرتے انسانی نمونوں کا پیدا کر دینا جن پر فرشتے بھی رشک کریں اور جن کو دیکھ کر ملک کے ملک مسلمان ہو جائیں اور ایک ایسا مکمّل زندہ معاشرہ وجود میں آئے جو ہر طرح سے مثالی اور معیاری کہلایا جا سکے، اس لئے بھی ضروری ہے کہ وہ دین و دعوت ہرگز کامیاب نہیں کہلائے جا سکتے جو اپنے داعیِ اوّل اور حاملِ پیغام کی زندگی میں دنیا کے سامنے معتدبہ تعداد میں کوئی مؤثّر و کامیاب عملی نمونہ اور مثالی معاشرہ نہ پیش کر سکیں، اور وہ درخت ہرگز باثمر اور شاداب نہیں کہا جا سکتا جو اپنی جوانی اور موسم بہار (عہدِ نبوت) میں شیریں پھل نہیں دے سکا اور عطر بیز شگوفے نہیں کھلا سکا، زمانۂ نبوت گذر جانے کے بعد اس دین و دعوت کے نمائندوں اور داعیوں کا منہ نہیں ہے کہ مُرورِ زمانہ کے بعد اپنی معاصر نسل اور ہم عصر دنیا کو ایمان و عمل، خود سپردگی اور مکمل تبدیلی کی دعوت دے سکیں، جبکہ وہ اس کے ابتدائی و اوّلین عہد کی کوششوں کا کوئی ناقابل انکار اور اثر انگیز کامیاب نتیجہ نہیں پیش کر سکے۔

خاندانی سلطنت کے قیام و عروج کے بارے میں پیغمبر کا بیان

سلطنت اور دنیا دار قائدین اور رہنماؤں سے کھلا امتیاز

۲۔ اس داعیِ دین، مُرسَل من اللہ اور حاملِ رسالت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ

وہ بانیانِ سلطنت، فاتحین وکشور کُشاؤں، سیاسی قائدین ورہنماؤں سے اپنے مزاج ومذاق، کردار وعمل اور مقاصد ونتائج میں نہ صرف کھلا امتیاز رکھتا ہو، بلکہ اس میں اور اس گروہ میں بیّن تبائن اور تضاد پایا جاتا ہو، بانیانِ سلطنت، فاتحین ممالک، دنیا کے حوصلہ مند اور طالع آزما رہنماؤں کی کوششوں کا محور اور جدّوجہد کا مقصدِ اعلیٰ یا کم سے کم قدرتی ولازمی نتیجہ خاندانی سلطنت کا قیام اور موروثی حکومت کی تاسیس ہوتی ہے، اور یہ سلسلہ (جیسے کہ رومی، بازنطینی، ساسانی، کیانی، سورج بنسی اور چندر بنسی خاندانوں کے عروج واقبال کی تاریخ بتاتی ہے) صدیوں تک چلتا ہے، اگر کسی غیر معمولی سبب کی وجہ سے یہ نہیں ہوسکتا تو کم سے کم درجہ یہ ہے کہ ان بانیانِ سلطنت اور فاتحین کشور کشاؤں اور ان سیاسی رہنماؤں کے (جو اپنی تحریک میں کامیاب ہوئے) خاندان، فراواں دولت اور وسیع اسبابِ عیش وعشرت کے مالک بن جاتے ہیں، وہ اردو مثل کے مطابق "دودھوں نہاتے اور پوتوں پھلتے ہیں" اور سونے اور چاندی کے جھولوں میں جھولتے ہیں، گویا جنگل میں ایک شیر شکار کرتا ہے اور سیکڑوں جانور کھاتے ہیں، رومۃ الکبریٰ اور تختِ کیانی کے اورنگ نشینوں کے خاندانوں نے جو دادِ عیش وعشرت دی وہ ایسے الف لیلائی قصے ہیں، جن کے پیچھے اگر تاریخی شہادتیں نہ ہوتیں تو ناقابلِ یقین تھے[1]، کچھ اندازہ ایوانِ کسریٰ کے شان وشکوہ، فرشِ بہار[2] کی محیر العقول تفصیلات

---

[1] ایران بہ عہد ساسانیان" از پروفیسر آرتھر کرسٹن سین (PROF. ARTHUR CHRISTENSEN) پیرس ۱۹۳۶ء کا باب نہم "آخری شاندار عہد" نیز "تاریخ ایران" (از شاہین مکاریوس) ص۹۰۔ طبع دار الہلال قاہرہ مصر

[2] ملاحظہ ہو "تاریخ اسلام" مولوی عبدالحلیم شرر جلد ا ص۳۵۴ ماخوذ از "تاریخ طبری" وغیرہ۔

اور روم و ایران و ہندوستان کے شاہی خاندانوں اور ان کے متوسلین کی طرزِ زندگی اور معاشرت سے ہو سکتا ہے۔

اس کے برخلاف خدا کا پیغمبر نہ کسی خاندانی سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے، نہ اپنے خاندان کے مفادات کا تحفظ اور ان کے لئے عرصۂ دراز تک عیش و عشرت کے امکانات و مواقع کا انتظام کر جاتا ہے، جن کی بدولت وہ امت کے دوسرے طبقات کے مقابلہ میں زیادہ مرفہ الحالی اور فارغ البالی کی زندگی گذار سکیں، بلکہ اس کا معاملہ ان کے ساتھ برعکس ہوتا ہے، اور وہ اس کی زندگی میں بھی دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ زہد و قناعت، ایثار و قربانی اور عُسرت و جفاکشی کی زندگی گذارتے ہیں، اور اس کے بعد ان کو اپنی ذاتی صلاحیتوں اور جدّوجہد پر اعتماد کرنا پڑتا ہے، اور وہ برہمنوں اور پُروہتوں یا کسی مقدّس نسل و خاندان کی طرح مفت خور اور تن آسان نہیں رہ سکتے۔[۱]

پیغمبر کا لایا ہوا آسمانی صحیفہ محفوظ، قابلِ فہم اور عام دسترس میں ہو

۳۔ تیسری شرط یہ ہے کہ خدا کے اس پیغمبر پر جو آسمانی صحیفہ نازل ہوا ہو، اور جو اس کے دین کی اساس، اس کی دعوت و تعلیمات کا سرچشمہ، مخلوق کو خالق سے مربوط کرنے اور مربوط رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ، اپنے ماننے والوں میں سچی روحانیت پیدا کرنے کا طاقتور وسیلہ، عقائد بالخصوص عقیدۂ توحید کا قیامت تک کے لئے شارح، مُبیّن اور مُحافظ اور انسانیت کے لئے کتابِ ہدایت ہو، اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے

---

[۱] تفصیل آئندہ سطور میں آئے گی۔

لیا ہو، اور اس کے اپنے ایک ایک حرف و نقطہ کے ساتھ محفوظ، قابلِ فہم ہونے اور بکثرت تلاوت و قراءت اور حفظ و استحضار کا انتظام قدرتِ خداوندی نے اس طرح کیا ہو کہ اس کی دنیا میں کوئی دوسری مثال نہ ملتی ہو، اس لئے کہ وہ خدا کی آخری کتاب اور انسانیت کے لئے سفینۂ نجات ہے، وہ انسانی دست بُرد، تغیر و تبدّل، حذف و اضافہ اور تحریف کے ادنیٰ شائبہ سے محفوظ ہو، اس لئے کہ اس کے بغیر نہ ہر زمانہ میں اس کی دعوت دی جا سکتی ہے نہ سند کے طور پر اس کو پیش کیا جا سکتا ہے، نہ اس سے فائدہ اٹھایا اور پہونچایا جا سکتا ہے، عہد قدیم اور عہد جدید کی کتابوں (تورات، انجیل) اور صحف سماویہ کی تاریخ بتاتی ہے[۱] کہ وہ کس طرح ظالم حملہ آوروں اور دشمنانِ مذہب کے دست بُرد اور غارت گری کا شکار، دنیا پرست و ناخدا ترس مذہبی پیشواؤں کی تحریف لفظی و معنوی کا نشانہ اور انسانی تغافل اور اغراض دنیّہ کا میدان رہے اور یہ فرق اس وجہ سے ہے کہ ان کی حفاظت انھیں کے متبعین کے ذمہ رہی "بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ"[۲] (کیونکہ وہ کتابِ خدا کے نگہبان مقرر کئے گئے تھے اور اس پر گواہ تھے) (یعنی حکمِ الٰہی کا یقین رکھتے تھے) اور قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا ہے[۳] "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ"[۴] (بیشک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو پروفیسر سید نواب علی صاحب کی فاضلانہ کتاب "تاریخ صحف سماوی" اور راقم سطور کی کتاب "منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین" مضمون "پہلے آسمانی صحیفے اور قرآن، علم و تاریخ کی میزان میں" ص ۲۲۷-۲۴۳ [۲] سورۃ المائدہ۔ ۴۴

[۳] قرآن مجید کی محفوظیت کے بارے میں غیر مسلموں کی شہادتیں آگے آئیں گی۔ [۴] سورۃ الحجر۔ ۹

اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔)

نبی کی ذات ہی واحد مرکزِ ہدایت اور تنہا شارع و مُطاع ہو

۴۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ نبی کی ذات ہی مرکزِ ہدایت، سرچشمۂ قیادت اور امت کی قلبی وابستگی اور ذہنی سپردگی کا محور ہو۔ اگر خالقِ کائنات کے بارے میں "توحید" کا عقیدہ ضروری ہے تو نبی کے ساتھ اطاعت، عقیدت و محبت اور اس کے "دانائے سُبُل، ختم الرُّسل، مولائے کُل" ہونے کے سلسلہ میں امت کے اندر "وحدت" ضروری ہے، اور اگر "شرک فی الالوہیت" کے مقابلہ میں ہم "شرک فی النُّبوۃ" کی تعبیر پسند نہ کریں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی کے علاوہ امت کی کسی دوسری ہستی کو (خواہ وہ اس سے کیسا ہی قُرب و اختصاص رکھتی ہو) معصوم، مُفترض الطاعۃ اور اس کو کسی طرح کی وحی کا مورد سمجھنا اگر شرک فی النبوۃ نہیں ہے تو "مشارکۃ فی النبوۃ" ضرور ہے، امت کی وحدت اور اس کی شیرازہ بندی، اعتقادی، عملی انتشار سے حفاظت اور اس کی اندرونی طاقت، قوتِ ایمانی اور مرکزیت بہت کچھ ختم نبوت کے عقیدہ سے وابستہ ہے[1]، اور "مشارکۃ فی النبوۃ" کا عقیدہ[2] اس کے منافی ہے۔

اب ہم ایک ایک شرط کو لیتے ہیں، اور معتبر تاریخ کی روشنی، مسلم اور غیر مسلم فضلاءؒ

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب "منصب نبوت" کا آٹھواں خطبہ ختم نبوت، ص ۲۵۱-۲۸۵

[2] فرقۂ امامیہ اثنا عشریہ کے یہاں امامت کا عقیدہ اور امام کی تعریف اور خصائص، ختم نبوت کے منافی اور مشارکۃ فی النبوۃ کے مرادف ہیں، تفصیل آگے آئے گی۔

مفکرین و مورخین کی شہادتوں اور واقعات کی مدد سے ہم اس کا حقیقت پسندانہ معروضی جائزہ لیتے ہیں۔

اصلاح وتربیت اور قلب ماہیت کا سب سے بڑا پیغمبرانہ کارنامہ

"جہاں تک پہلی شرط کا تعلق ہے تو واقعہ یہ ہے کہ ہر نبوت نے اپنے دور میں آدم گری اور مردم سازی کا ایسا کارنامہ انجام دیا اور ایسے افراد تیار کئے جنھوں نے اس دنیا کو نئی زندگی بخشی اور زندگی کو (جو انسان کی خود فراموشی اور غلط اندیشی سے بے معنی ہو گئی تھی) بامعنی بنایا، نبوت کے ان کارناموں میں جو زندگی کی پیشانی پر درخشاں اور تاباں ہے سب سے روشن کارنامہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کارنامہ ہے جس کی سب سے زیادہ تفصیلات تاریخ میں محفوظ ہیں، مردم سازی اور آدم گری کے اس کام میں اللہ تعالےٰ نے آپ کو جو کامیابی عطا فرمائی وہ آج تک کسی انسان کو حاصل نہیں ہوئی، آپ نے جس سطح سے تعمیر انسانیت کا کام شروع کیا اس سطح سے کسی پیغمبر، کسی مصلح اور کسی مربّی کو شروع کرنے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی تھی، یہ وہ سطح تھی جہاں حیوانیت کی سرحد ختم ہوتی تھی اور انسانیت کی سرحد شروع ہوتی تھی، اور جس سطح پر آپ نے اس کام کو پہونچایا اس سطح تک بھی کبھی تعمیر انسانیت کا کام نہیں پہونچا، جس طرح آپ نے انسانیت کی انتہائی پستی سے کام شروع کیا اسی طرح انسانیت کی آخری بلندی تک اس کام کو پہونچایا۔

انسانی عالمی مرقع کی سب سے حسین تصویر

آپ کے تیار کئے ہوئے افراد میں سے ایک ایک نبوت کا شاہکار ہے، اور

نوعِ انسانی کے لئے باعثِ شرف وافتخار ہے، انسانیت کے مُرقّع میں بلکہ اس پوری کائنات میں پیغمبروں کو چھوڑ کر اس سے زیادہ حسین وجمیل، اس سے زیادہ دلکش ودل آویز تصویر نہیں ملتی، جو ان کی زندگی میں نظر آتی ہے، ان کا پختہ یقین، ان کا گہرا علم، ان کا سچّا دل، ان کی بے تکلّف زندگی، ان کی بے نفسی، خدا ترسی، ان کی پاکبازی، پاکیزگی، ان کی شفقت ورافت، اور ان کی شجاعت وجلادت، ان کا ذوقِ عبادت اور شوقِ شہادت، ان کی شہسواری اور ان کی شب زندہ داری، ان کی سیم وزر سے بے پروائی اور ان کی دنیا سے بے رغبتی، ان کا عدل، ان کا حُسنِ انتظام دنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا، نبوّت کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے جو انسانی افراد تیار کئے ان میں ایک ایک فرد ایسا تھا جو اگر تاریخ کی متواتر شہادتیں نہ ہوتیں، تو ایک شاعرانہ تخیّل اور ایک فرضی افسانہ معلوم ہوتا، لیکن اب وہ ایک تاریخی حقیقت اور ایک مسلّم الثّبوت واقعہ ہے، جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔

خاکی و نوری نہاد

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت ایک ایسا انسانی مجموعہ تھا جس میں نبوت کے اعجاز نے متضاد انسانی کمالات پیدا کر دیئے تھے، علامہ اقبال کے الفاظ میں ؎

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولیٰ صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے غریب — عہدِ کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل

ساقیِ اربابِ ذوق، فارسِ میدانِ شوق
بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اس کی اصیل[1]

اب ہم اس کے بارے میں کچھ تاریخی شہادتیں اور بیانات نقل کرتے ہیں، تاکہ معلوم ہو کہ یہ محض عقیدت مندی پر مبنی یک طرفہ بیان نہیں ہے۔

سیدنا علی مرتضیٰؓ اور صحابۂ کرامؓ

ہم اس سلسلہ کا آغاز سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے خطبات کے دو اقتباسات سے کرتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے بارے میں (جن کی ذات بعض مکاتبِ خیال اور فرقوں کے یہاں موضوعِ بحث بن گئی ہے) ان کی شہادت شہادتِ عینی کے مصداق اور ان کا بیان اہلِ بیت کرام کی صداقت اور بلاغت و فصاحت علوی کا مظہر ہے، یہ ملحوظ رہے کہ یہ بیان اپنے ان رفقاء کے متعلق ہے جو ان کی زندگی میں سفر آخرت اختیار کر چکے اور اس وقت دنیا میں موجود نہیں تھے، یہ بیان صرف چار جلیل القدر صحابہ اور رفقاء (سلمان فارسیؓ، ابوذر غفاریؓ، مقداد بن الاسودؓ عمار بن یاسرؓ) کے متعلق نہیں ہو سکتا جن میں سے متعدد ان کی زندگی میں موجود، اور ان کے ہم رکاب ہیں[2]، یہ اقتباسات آپ کے خطبات اور رسائل و فرامین کے (حضرات شیعہ کے نزدیک) معتبر اور متفق علیہ مجموعہ "نہج البلاغۃ" سے ماخوذ ہیں، جو شہرۂ آفاق ہاشمی شیعی ادیب و شاعر "الشریف الرضی" (۳۵۹–۴۰۴ھ) کا جمع کیا ہوا ہے، جو اپنے عہد سے لے کر اس عہد تک مستند، متداول اور متبرک ہے، اور جس کی شرح مشہور شیعہ عالم

---

[1] واوین کے درمیان کی عبارت مصنف کے رسالہ "نبوت کا کارنامہ" سے ماخوذ ہے مطبوعہ "ذکری" رامپور

[2] حضرت عمار بن یاسرؓ نے خلافت مرتضوی میں ۳۷ھ میں اور سلمان فارسیؓ نے ۳۶ھ میں وفات پائی، حضرت علی کی شہادت ۴۰ھ کا واقعہ ہے۔

و متکلم ابن ابی الحدید (۵۸۶-۶۵۵ھ) نے بڑے شرح و بسط کے ساتھ لکھی ہے، خطابت و بلاغت کے اس شکوہ اور کمال کی بناء پر جو حضرت امیر المؤمنین کا حصہ ہے اور قارئین کو ہر طرح کے شک و شبہ سے دور رکھنے کے لئے ہم ایک طرف اصل عبارت نقل کرتے ہیں، دوسری طرف اس کا ترجمہ دیتے ہیں، امیر المؤمنین فرماتے ہیں:-

لقد رأیتُ أصحابَ محمد	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فما	وسلم کے اصحاب کی ایسی شان دیکھی ہے
أرى أحداً یشبههم منکم لقد	کہ میں تم میں سے کسی کو ان کا مشابہ
کانوا یصبحون شُعثاً غُبراً،	نہیں پاتا، وہ صبح اس حال میں نظر آتے
وقد باتوا سُجّداً وقیاماً،	تھے کہ ان کے بال بکھرے ہوئے
یراوحون بین جباههم و	غبار آلود ہیں، رات انھوں نے سجدے
خدودهم، ویقفون علی	اور قیام میں گذاری ہوتی، کبھی اپنی
مثل الجمر من ذکر معادهم!	پیشانیوں پر جھکے ہوتے تھے، کبھی اپنے
کأنّ بین أعینهم رکب المعزی	رخساروں پر، قیامت کی یاد سے ایسے
من طول سجودهم! إذا ذکر الله	بے چین نظر آتے تھے، جیسے انگاروں
هملت أعینهم حتی تبلّ جیوبهم	پر کھڑے ہوں، ان کی پیشانی (کثرت
ومادوا کما یمید الشجر یوم الریح	وطول سجود سے) ایسی سخت و خشک
العاصف، خوفاً من العقاب	معلوم ہوتی تھی جیسے بکری کی ٹانگ،
ورجاءً للثواب۔[1]	اللہ کا نام لیا جاتا تو ان کی آنکھیں

[1] نہج البلاغة تحقیق الدکتور صبحی الصالح استاذ الاسلامیات وفقه اللغة فی کلیة الآداب بالجامعة اللبنانیة، طبع دار الکتاب اللبنانی - بیروت ص ۱۴۳

ایسی اشک بار ہو جاتیں کہ ان کے
گریبان اور دامن تر ہو جاتے اور وہ
اس طرح لرزتے ہوئے نظر آتے
جیسے تیز آندھی کے وقت درخت،
سزا کے خوف اور ثواب کی امید میں۔

دوسرے خطبہ میں فرماتے ہیں:۔

أين القوم الذين دعوا الى الاسلام فقبلوه، وقرأوا القرآن فأحكموه، وهيجوا الى القتال فولهوا وله اللقاح إلى أولادها، وسلبوا السيوف أغمادها، واخذوا باطراف الأرض زحفا زحفا وصفا صفا بعض هلك وبعض نجا، لايبشرون بالأحياء ولايُعزّون بالموتى، مُره العيون من البكاء خمص البطون من الصيام، ذُبل الشفاه من الدعاء صُفر الألوان من السهر على وجوههم

وہ لوگ کہاں ہیں جن کو اسلام کی دعوت دی گئی تو انھوں نے اس کو قبول کیا، قرآن پڑھا تو اس پر اچھی طرح سے عمل کیا، جہاد کے لئے ان کو جوش دلایا گیا تو اس طرح اس کی طرف بڑھے جیسے اونٹنیاں اپنے بچوں کی طرف دوڑ کر جاتی ہیں، انھوں نے تلواریں بے نیام کرلیں، اور اطراف زمین لیا گروہ در گروہ ہو کر پروانہ وار بڑھے، کوئی شہید ہو گیا کوئی بچا، نہ ان کو اپنے ساتھیوں کی زندگیوں کی مبارکباد دی جاسکتی ہے (اس لئے کہ وہ شہادت کو نعمت سمجھتے ہیں) نہ دنیا سے

غبرۃُ الخاشعین۔

اولئك اخوانی الذاھبون

فحق لنا أن نظمأ إليھم ونعض

الأيدی علی فراقھم۔

رخصت ہونے والے ساتھیوں پر ان سے تعزیت کی جا سکتی ہے (کیونکہ وہ ان پر رشک کرتے ہیں اور ان کو کامیاب سمجھتے ہیں) ان کی آنکھیں فرطِ گریہ سے سفید ہو گئیں، ان کے پیٹ روزوں کی وجہ سے پیٹھ سے لگے ہوئے ہیں، ان کے ہونٹ دعا سے خشک ہو رہے ہیں، ان کے رنگ بے خوابی و شب بیداری سے زرد ہیں، ان کے چہروں پر اہل خشیت کی اداسی ہے۔

یہ میرے وہ بھائی ہیں جو دنیا سے چلے گئے ہم کو حق ہے کہ ہم میں ان سے ملنے کی پیاس پیدا ہو اور ہم ان کی جدائی پر ہاتھ ملیں۔

صحابۂ کرامؓ و شیخین کے بارے میں غیر مسلم فضلاء اور مستند مغربی مورخین کی شہادتیں

اس مبارک آغاز کے بعد ہم چند غیر مسلم فضلاء اور مستند مورخوں کی شہادتیں نقل کرتے ہیں، مغربی فاضل کائتانی اپنی کتاب "سنینِ اسلام" میں کہتا ہے:۔

لہ نھج البلاغۃ تحقیق الدکتور صبحی الصالح۔ ص۱۷۷-۱۷۸

"یہ لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی وراثت کے سچے نمائندے، مستقبل میں اسلام کے مبلّغ، اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے خدا رسیدہ لوگوں تک جو تعلیمات پہنچائی تھیں اس کے امین تھے، رسول اللہؐ کی مسلسل قربت اور ان سے محبت نے ان لوگوں کو فکر و جذبات کے ایک ایسے عالم میں پہنچا دیا تھا، جس سے اعلیٰ اور متمدن ماحول کسی نے دیکھا نہیں تھا۔

درحقیقت ان لوگوں میں ہر لحاظ سے بہترین تغیر ہوا تھا، اور بعد میں انھوں نے جنگ کے مواقع پر مشکل ترین حالات میں اس بات کی شہادت پیش کی کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے اصول و افکار کی تخم ریزی زرخیز زمین میں کی گئی تھی، جس سے بہترین صلاحیتوں کے انسان وجود میں آئے، یہ لوگ مقدّس صحیفہ کے امین اور اس کے حافظ تھے، اور رسول اللہؐ سے جو لفظ یا حکم انھیں پہنچا تھا اس کے زبردست محافظ تھے۔

یہ تھے اسلام کے قابلِ احترام پیشرو جنھوں نے مسلم سوسائٹی کے اوّلین فقہاء، علماء اور محدّثین کو جنم دیا۔[۱]"

مشہور فرانسیسی مصنف ڈاکٹر لیبان (GUSTAVE LE BON) اپنی شہرۂ آفاق کتاب "تمدنِ عرب" میں لکھتا ہے:-

"غرض یہ ہے کہ اس نئے دین کو بہتیرے مواقع درپیش تھے اور بے شک وہ اصحابِ نبیؐ کی خوش تدبیری تھی، جس نے انھیں ان مواقع پر کامیاب کیا،

---

[۱] ماخوذ از CAETANI, ANNALI DELL' ISLAM, VOL. II P: 429

T. W. ARNOLD: PREACHING OF ISLAM. LONDON, (1925) P. 41-42

انھوں نے خلافت کے لئے ایسے ہی اشخاص کا انتخاب کیا جن کی ساری غرض اشاعتِ دینِ محمدی تھی"۔[1]

مشہور انگریز مصنف گبن (EDWARD GIBBON) خلفائے راشدین کے متعلق اپنی کتاب "زوال و سقوط روما" (DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE) میں لکھتا ہے:۔

"پہلے چار خلفاء کے اطوار صاف اور ضرب المثل تھے، ان کی سرگرمی، دلدہی اخلاص کے ساتھ تھی، اور ثروت و اختیار پاکر بھی انھوں نے اپنی عمر یں ادائے فرائض اخلاقی اور مذہبی میں صرف کیں"۔[2]

ڈاکٹر فلپ ہٹی (DR. PHILIP HITTI) اپنی مشہور کتاب "مختصر تاریخ عرب" (A SHORT HISTORY OF THE ARABS) میں لکھتا ہے:۔

"ابوبکرؓ مرتدین کو مغلوب کرنے والے اور جزیرۃ العرب کو اسلام کے جھنڈے کے نیچے متحد کرنے والے ایک سیدھی سادی زندگی گزارتے تھے، جو متانت و وقار سے بھری ہوئی تھی، وہ اپنی خلافت کی مختصر مدت کے پہلے چھ مہینے میں روزانہ اپنی قیام گاہ "سُنح" سے جہاں وہ اپنے مختصر خاندان کے ساتھ ایک معمولی سے مکان میں رہتے تھے، صبح اپنے دار الحکومت مدینہ کی طرف آتے تھے، وہ حکومت سے کوئی تنخواہ نہیں لیتے تھے، اس لئے کہ اس وقت حکومت کی کوئی آمدنی نہیں تھی، جو قابل ذکر ہو، وہ حکومت کے تمام کام مسجد نبویؐ کے صحن میں بیٹھ کر انجام دیتے تھے۔

---

[1] تمدن عرب صـ۱۳۴ ترجمہ شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی۔ مطبع آگرہ۔ صـ۱۳۴

[2] صـ۸۵-۳۸۴، جلد ۵، مطبوعہ لندن ۱۹۱۱ء

ان کے باصلاحیت جانشین عمرؓ (۴۴ - ۶۳۴ء) سادہ زندگی بسر کرنے والے اور بہت فعّال تھے، دراز قد، مضبوط جسم اور سر کے بال گر گئے تھے، خلیفہ ہونے کے بعد کچھ عرصہ تجارت ان کا ذریعہ معاش تھی، اور بالکل بدّو سرداروں کی طرح ان کی زندگی شان و شوکت اور لڑائی کے مظاہر سے دور تھی، ان کا بے داغ کردار ان کے جانشینوں کے لئے ایک مثال تھا، بتلایا جاتا ہے کہ ان کے پاس صرف ایک قمیص اور ایک لبادہ تھا، جس پر پیوند لگے ہوئے تھے، کھجور کی چھال بھرے ہوئے بستر پر سوتے تھے، اور انھیں دین کی پاسداری، انصاف اور حکومت کو اسلام اور عربوں کے لئے محفوظ رکھنے کے علاوہ اور کسی بات کی فکر نہیں تھی۔"[1]

سر ولیم میور (SIR WILLIAM MUIR) اپنی مشہور کتاب "THE ANNALS OF EARLY CALIPHATE" (تاریخ خلافت اولیٰ) میں لکھتے ہیں:-

"ابو بکرؓ کے دربار کی سادگی کا وہی عالم تھا جو محمدؐ کی زندگی میں تھا، نہ خدّام تھے اور نہ محافظ اور نہ حکومت کی شان و شوکت ظاہر کرنے والی کوئی اور شئے، ابو بکرؓ محنت کے عادی تھے، اور ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاملات کی جزئیات پر بھی نظر رکھتے تھے، راتوں کو وہ مصیبت زدہ اور غرباء

---

[1] فلپ۔ کے۔ ہٹی (PHILIP - K - HITTI) ہسٹری آف دی عربس (HISTORY OF THE ARABS) لندن - ۱۹۵۲ء - صفحہ ۷۶ - ۱۷۵

کی تلاش میں گھومتے رہتے، حکومت کے عمّال اور اعلیٰ حکام کو تعینات کرنے میں کنبہ پروری یا طرف داری سے بالاتر تھے، اور ان کے کردار سے عقل و دانش کا اظہار ہوتا ہے"[1]

وہ مزید لکھتے ہیں:-

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سے سلطنتِ اسلام میں سب سے بڑے شخص عمر رضؓ تھے، کیونکہ انھیں کی دانائی، استقلال کا ثمرہ تھا کہ اس دس سال کی مدت میں شام، مصر، فارس کے علاقے جن پر اس وقت سے اسلام کا قبضہ رہا ہے، تسخیر ہو گئے، ...... مگر باوجود ایسی عظیم الشان سلطنت کے فرمانروا ہونے کے آپ کو کبھی اپنے فیصلہ فراست اور متانت کی میزان میں پاسنگ رکھنے کی ضرورت نہیں ہوئی، آپ نے سردار عرب کے سادہ اور معمولی لقب سے کسی زیادہ عظیم الشان لقب کے ساتھ اپنے آپ کو ملقب نہیں کیا، دُور دراز صوبوں سے لوگ آتے اور مسجد نبویؐ کے صحن کے چاروں طرف نظر دوڑا کر استفسار کرتے کہ خلیفہ کہاں ہیں؟ حالانکہ شہنشاہ یعنی خلیفہ سادہ لباس میں ان کے سامنے بیٹھے ہوتے تھے"[2]

جسٹس سید امیر علی کے بیانات

سُنّی فضلاء اور مصنفین کے بجائے ہم چند اقتباسات رائٹ آنریبل جسٹس

---

[1] THE ANNAL OF EARLY CALIPHATE, LONDON 1882, P. 123

[2] ایضاً، ترجمہ ماخوذ از "آیات بینات" از نواب محسن الملک ص ۲۰-۲۱ (مطبع مصطفائی ۱۳۱۵ھ)

سید امیر علیؒ کی کتاب (A SHORT HISTORY OF THE SARACENS) سے پیش کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:۔

"خلفائے راشدین کے زمانہ میں مسلمانوں کی جو سیاسی حالت تھی اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو جو منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے وہ ایک عوامی حکومت کا ہے، جس کا سربراہ ایک منتخب شدہ امیر تھا، جو محدود اختیار کا مالک تھا، رئیس مملکت کے خصوصی اختیارات انتظامی اہتمامی امور کے دائرہ کے اندر محصور تھے..... قانون سب کے لئے ایک تھا، امیر کے لئے بھی اور غریب کے لئے بھی، صاحب اقتدار کے لئے بھی اور کھیت پر محنت و مشقت کرنے والے کے لئے بھی۔"[2]

آگے لکھتے ہیں:۔

"خلفائے راشدین نے جس سخت گیری سے اپنے آپ کو عوام کی بہبود کے لئے وقف کر رکھا تھا، اور جس انتہائی سادگی سے وہ زندگی بسر کرتے تھے، وہ ہادیِ اسلام کی مثال کی پوری پوری تقلید تھی، انھوں نے خدم وحشم اور ظاہری

---

[1] سید امیر علی (۱۸۴۹ء - ۱۹۲۸ء) سادات کے ایک شیعہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جو خراسان سے نادر شاہ کے ساتھ آیا، محسنیہ ہگلی کالج کلکتہ میں انگریزی اور عربی کی تعلیم حاصل کی اور قانون کا مطالعہ کیا، ۱۸۷۳ء میں بیرسٹری کی سند حاصل کی، ۱۹۰۴ء میں بنگال ہائی کورٹ سے سبکدوش ہوئے، اور انگلستان میں مستقل سکونت اختیار کر لی، ۱۹۰۹ء میں لندن کی پریوی کونسل کی قانونی کمیٹی کے پہلے ہندوستانی رکن منتخب ہوئے، ۱۹۲۸ء میں انتقال کیا، اسلامیات پر لکھنے والے شاید کسی ہندوستانی مصنف کے پاس ایسا پُرزور قلم اور اس کو اہل زبان کی طرح انگریزی پر ایسی قدرت ہو جتنی کہ سید امیر علی کو تھی، بقول مستشرق (OSBORN) "کم ایسے اہلِ زبان ہوں گے جو مصنف کے اسلوب کا مقابلہ کر سکیں۔"

[2] ماخوذ از "روح اسلام" ترجمہ "SPIRIT OF ISLAM" مطبوعہ ادارۂ ثقافت لاہور صفحہ ۴۳۰-۴۳۱

شان و شوکت کے بغیر محض اپنے حسن کردار اور سیرت کی مدد سے لوگوں کے دلوں پر حکومت کی"[1]

جہاں تک شیخین (خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ اور خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ) کا تعلق ہے، سید امیر علی نے ان کے زاہدانہ طرز زندگی ان کی معدلت شعاری اور ان کی خدمات اور احسانات کا پوری فراخ دلی اور زور قلم کے ساتھ اعتراف کیا ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"عربوں میں کسی قبیلہ کی سرداری اور سربراہی موروثی نہیں ہوتی، اس کا انحصار انتخاب پر ہوتا ہے، عمومی حق رائے دہندگی کے اصول پر شدت سے عمل کیا جاتا ہے، قبیلہ کے تمام افراد کی سردار کے انتخاب میں آواز ہوتی ہے، انتخاب متوفیٰ کے پسماندگان کے افراد نرینہ میں سن و سال، بزرگی و تقدم (SENIORITY) کے اصول پر ہوتا ہے۔

اس قدیم قانون و روایت کی پیغمبر صاحب کے جانشین کے انتخاب میں بھی پابندی کی گئی، چونکہ حالات کی نزاکت کسی تاخیر کی اجازت نہیں دیتی تھی، اس لئے ابوبکرؓ جو اپنی عمر اور اس حیثیت و مرتبہ کی بناء پر جو ان کو مکہ میں حاصل تھا، اور وہ عربوں کے حساب و اندازہ میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے، بغیر کسی تاخیر کے خلیفہ یا پیغمبر کے جانشین منتخب ہوئے۔

ابوبکرؓ اپنی دانشمندی اور اعتدال کی وجہ سے امتیاز خاص کے مالک تھے، ان کے انتخاب کو حضرت علیؓ اور خاندان نبوت نے اپنی روایتی خلوص اور

---

[1] روح اسلام ص ۴۳۳

اسلام کے ساتھ وفاداری اور دلی وابستگی کی بناء پر تسلیم کیا۔[1]

آگے چل کر حضرت عمرؓ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"حضرت ابوبکرؓ کا مختصر دورِ خلافت ریگستانی قبیلوں میں امن و امان قائم کرنے ہی میں صرف ہو گیا، انھیں صوبوں کی باقاعدہ تنظیم کی مہلت نہ ملی لیکن جب حضرت عمرؓ جو صحیح معنوں میں ایک عظیم انسان تھے، مسندِ خلافت پر بیٹھے تو اس وقت محکوم قوموں کی فلاح و بہبود کے بارے میں انتھک کوششوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو ابتدائی مسلم حکومتوں کا طرۂ امتیاز ہے"۔[2]

حضرت عمرؓ کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"حضرت عمرؓ کی جانشینی اسلام کے لئے بڑی قدر و قیمت کی حامل تھی، وہ اخلاقی طور پر ایک مضبوط طبیعت و سیرت کے آدمی، انصاف کے بارے میں بڑے بااصول اور حساس، بڑی قوتِ عمل اور سیرت کی پختگی کے آدمی تھے"۔[3]

"حضرت عمرؓ کی وفات اسلام کے لئے ایک بڑا سانحہ اور خسارہ تھا، سخت لیکن منصف، دور بین، اپنی قوم کی سیرت و مزاج کا بڑا وسیع تجربہ رکھنے والے ایک ایسی قوم کی قیادت کے لئے بڑے موزوں تھے جو بے آئینی کی خوگر تھی، اپنے مضبوط ہاتھ میں تازیانہ رکھتے ہوئے خانہ بدوش قبائل اور ان نیم وحشی لوگوں کے قدرتی رجحانات کو انھوں نے قابو میں رکھا اور ان کو اس وقت

---

[1] "A SHORT HISTORY OF THE SARACENS" P. 21 [2] روحِ اسلام ص ۴۳۰

[3] "A SHORT HISTORY OF THE SARACENS" P. 27

اخلاقی گراوٹ سے بچالیا جب ترقی یافتہ شہروں کے عیش وعشرت اور وسائل راحت اور مفتوحہ ملکوں کی دولت سے ان کا سابقہ پڑ رہا تھا"... ..... وہ اپنی رعیت کے ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے دسترس میں تھے، رات میں لوگوں کی حالت معلوم کرنے کے لئے بغیر کسی محافظ یا مصاحب کے گشت کرتے، یہ اس شخص کی حالت تھی جو اپنے عہد کا سب سے طاقت ور حکمراں تھا"[1]

حضرت عثمان غنی رضؓ

مستند تاریخ کی شہادت ہے کہ خلیفۂ سوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زندگی بھی سادہ اور زاہدانہ تھی، وہ باہر سے آنے والے وفود اور خلافت کے مہمانوں کو پُرتکلف کھانا کھلاتے تھے، لیکن ان کو گھر میں روغنِ زیتون یا سرکہ کے ساتھ روٹی کھاتے دیکھا گیا ہے[2]، صائم الدہر تھے، خُدّام کے باوجود اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے، رات کو کسی ملازم کو جگاتے نہیں تھے، فرماتے تھے کہ رات ان کی ہے[3]۔

ان کا ایک غلام تھا، انھوں نے اس کے کبھی کان کھینچے تھے، اپنے عہدِ خلافت میں اس سے کہا کہ تم مجھ سے قصاص لے لو، اس نے ان کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا، حضرت عثمانؓ نے کہا، اچھی طرح سے بدلہ لے لو، دنیا میں بدلہ ہو جائے آخرت میں

لہ "A SHORT HISTORY OF THE SARACENS" P. 43

۲ہ روایت شرحبیل بن مسلم بسند صحیح "حلیۃ الاولیاء" ابی نعیم۔ جلد ا صفحہ ۶۰

۳ہ طبقات ابن سعد جلد ۳ صفحہ ۶۰

حساب باقی نہ رہے[1] عبدالملک بن شدّاد کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمان رضؓ کو اپنے عہد خلافت میں جمعہ کے دن منبر پر دیکھا، ان کے جسم پر ایک موٹی عدنی چادر تھی، جس کی قیمت چار یا پانچ درہم ہوتی تھی[2] حسن بصریؒ راوی ہیں کہ میں نے حضرت عثمانؓ کو دیکھا کہ وہ مسجد میں دوپہر کو آرام کر رہے ہیں، کھڑے ہوتے ہیں تو ان کے پہلو پر کنکریوں کا نشان نظر آتا ہے اور لوگوں میں چرچا ہے کہ یہ امیر المومنین ہیں[3] منبر پر بیٹھ کر بازار کے نرخ وغیرہ دریافت کرتے تھے، مسلمانوں کے معاملات کا ان کو بڑا اہتمام تھا، موسیٰ بن طلحہ راوی ہیں کہ میں نے حضرت عثمانؓ کو دیکھا منبر پر بیٹھے ہوئے ہیں، مؤذن اقامت کہہ رہا ہے، اور وہ لوگوں سے ان کے حالات اور سفر کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں[4] ان کے ایثار و قربانی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے ان باغیوں سے جو مصر سے آکر ان پر حملہ آور ہوئے تھے، طاقت موجود ہونے کے باوجود لڑنا اور کسی مسلمان کا خون بہانا پسند نہیں کیا اور اسی حال میں قرآن مجید پڑھتے ہوئے جان دی، اسی کے ساتھ خلافت سے دستبردار ہونا بھی گوارا نہیں کیا جس کو وہ مسلمانوں کی امانت اور احادیث اور اشاراتِ نبویؐ کی بناء پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منشا سمجھتے تھے[5]

بقول سید امیر علی "ان کی سب سے بڑی خوبی خدا ترسی تھی"[6] جب کہ ولیم میور کے مطابق "وہ بہت نرم دل تھے، اور اگر انھیں امن و امان کا زمانہ

---

[1] الریاض النضرة فی فضائل العشرة للمحب الطبری۔ ورق ۵۰۲ (ب) نمبر مخطوطہ ۱۲۸۴ کتب خانہ ندوۃ العلماء [2] حلیۃ الاولیاء (ابی نعیم) جلد ا ص۶۰ [3] ایضاً ص۶۰
[4] طبقات ابن سعد ۳/۵۹ [5] ماخوذ از کتب تاریخ۔ تاریخ الخلفاء (سیوطی) البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر۔ طبع ۱۹۶۶ء) وغیرہ مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۹۵۳ء بیروت مکتبۃ المعارف۔
[6] A SHORT HISTORY OF SARACENS, LONDON, 1955, P. 48

ملتا تو وہ عوام میں بہت مقبول ہوتے[1]، شارٹر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام
(SHORTER ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM.) میں لیوی ڈیلا ویڈا
(LEVI DELLA-VIDA) رقم طراز ہے کہ "ویلہاؤسن (WELLHAUSAN)
نے ذکر کیا ہے اور کیٹیانی (CAETANI) نے زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے،
عثمانؓ نے عمرؓ کی پالیسی پر ہی عمل کیا اور اسے اور ترقی دی[2]"۔

خلافت عثمانی میں جو بارہ سال کے عرصہ پر محیط ہے ایسی عظیم الشان فتوحات
حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ہوئیں جن کی نظیر اس سے پیشتر کی تاریخ میں نہیں ملتی،
—— اس زمانہ میں اسلامی مملکت کے دائرہ میں بڑی وسعت ہوئی، اس کے حدود
سندھ سے لے کر اندلس (اسپین) تک جا پہونچے، اسلامی افواج نے اس عہد میں
بڑی جنگوں کے علاوہ بحری قوت کا بھی مظاہرہ کیا اور قبرص، روڈس کے جزائر
فتح کئے، ایک عظیم الشان بحری بیڑا تیار کیا گیا، حالانکہ اس سے پیشتر ان کے
پاس ایک کشتی بھی نہ تھی، اسلامی فوج ۳۲ھ میں ابنائے قسطنطنیہ (باس فورس) تک
جا پہونچی ۲۵ھ میں طرابلس الغرب (لیبیا) پر فوج کشی ہوئی اور دو ہی سال بعد
تونس الجزائر اور مراکش کے علاقوں کو فتح کر لیا گیا، اسی سال عبداللہ بن نافع نے
سمندر پار کر کے اندلس کا محاصرہ کیا، مسلمانوں کی فوجیں تفلس (رک بآں) اور
بحیرۂ اسود کے کناروں تک جا پہونچیں، ۳۰ھ میں خراسان اور طبرستان کی طرف

---

[1] WILLIAM MIUR ANNAL OF EARLY CALIPHATE. LONDON 1882. P. 341

[2] SHORTER ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM. LEIDEN—1953 P. 116

پیش قدمی ہوئی، جرجان خراسان طبرستان فتح ہوا، عبداللہ بن عامر نے مزید آگے جاکر سوات، کابل، سجستان، نیشاپور اور ارد گرد کے علاقوں کو مطیع بنایا طخارستان اور کرمان فتح ہوئے اور یوں کوہ قاف اور بحر خزر (قزوین) تک اسلامی حکومت وسیع ہوگئی، ان کے مبارک عہد میں مسلمانوں نے ہندوستان کی طرف بھی توجہ دی اور گجرات کے ساحلی علاقوں تک ان کے قدم جا پہونچے،[ل] ان کے عہدِ خلافت میں تہذیب و تمدن، صنعت و حرفت، تجارت و علوم فنون کو بھی ترقی ہوئی، دولت و ثروت اور فارغ البالی کا دَور دَورہ ہوا۔

ان کی ایک اہم خدمت مسجد الحرام کی توسیع ہے جو ۲۶ھ میں کی گئی، ۲۹ھ میں انھوں نے مسجد نبوی کی تعمیر و توسیع کرائی، بحری فتوحات کے سلسلہ میں بھی حکم دیا کہ مفتوحہ علاقوں میں مسجدیں تعمیر کی جائیں اور پُرانی مساجد مزید وسیع کی جائیں، ان کا سب سے بڑا اور عظیم الشان کارنامہ عالم اسلام کو ایک مصحف اور ایک قرأت پر جمع کرنا تھا، قرآن مجید کو لکھوا کر تمام ممالک اسلامیہ میں شائع کرنا اور ایک ہی قراءت پر سارے ممالک اسلامیہ کو متحد کر دینا خلافتِ عثمانیہ کا مہتم بالشان واقعہ ہے۔[۲]

[ل] ان وسیع اور عظیم فتوحات کے نتیجہ میں جس وسیع پیمانہ پر اسلام کی اشاعت ہوئی اور ملک کے ملک اور قوموں کی قومیں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں اس کا آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے اور تاریخ سے اس کی شہادتیں ملتی ہیں۔

[۲] تلخیص از اردو دائرۂ معارف اسلامیہ جلد ۱۲ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور ۱۹۷۳ء

یہاں اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب حضرت علیؓ سے کوفہ کے کچھ لوگوں نے اس بات کی شکایت کی کہ ان کے پیشرو نے قرآن مجید کی ایک قرأت پر (باقی ص۳۸ پر)

حضرت علی مرتضیٰ رضؓ

جہاں تک خلیفہ چہارم سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی ذات گرامی کا تعلق ہے ان کے بارے میں سوائے خوارج کے کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہم یہاں ان کے ایک رفیق ضرار بن ضمرہ کا ایک بیان پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جس میں انھوں نے حضرت معاویہؓ کی فرمائش و اصرار پر امیر المومنین کے بارے میں اپنی معلومات، مشاہدات و تأثرات پیش کئے، اور الفاظ میں تصویر کشی کی کوشش کی، اس سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ خلافت و حکومت میں بھی اس قدسی جماعت کی کیا حالت تھی، جو درسگاہ نبوّت اور مدرسۂ ایمانی و قرآنی سے تیار ہو کر نکلی تھی۔

"ان کو دنیا اور اس کی بہار اور رونق سے وحشت ہوتی تھی، اور رات اور اس کی تاریکی میں دل بہلتا تھا، آنکھیں پُر اشک رہا کرتی تھیں، ایک لمبے فکر اور سوچ میں رہا کرتے تھے، لباس وہ پسند آتا جو موٹا ہو، کھانا وہ دل کو بھاتا جو معمولی

(باقی صـــ۳۷ کا) لوگوں کو جمع کر دیا ہے تو حضرت علیؓ نے انتہائی برہمی کے ساتھ جواب دیا:۔

"خاموش! عثمانؓ نے ہم میں سے سربرآوردہ صحابہ کی رائے سے ہی یہ قدم اٹھایا تھا، اور اگر اس وقت ان کے بجائے میں خلیفہ ہوتا تو میں بھی یہی کرتا!"

WILLIAM MIUR ANNAL OF EARLY CALIPHATE, LONDON 1822, P. 308

اور سادہ ہو، بالکل معمولی آدمی کی طرح رہتے، ہم میں ان میں کوئی فرق معلوم نہ ہوتا، جب ہم کچھ پوچھتے تو جواب دیتے، جب ہم آتے تو وہ سلام میں پہل کرتے، جب ہم بلاتے تو بے تکلف آجاتے، لیکن ان کے یہاں اس تقرب اور ہمارے اس قُرب کے باوجود رُعب اتنا تھا کہ ہم گفتگو نہ کرسکتے، اور خود چھیڑ کر بات نہ کرسکتے، دینداروں کی تعظیم کرتے تھے، اور مسکینوں سے محبت رکھتے تھے، طاقتور کو ان سے کسی غلط چیز کی امید نہ ہوتی، اور کمزور ان کے انصاف سے ناامید نہ ہوتا، بخدا میں نے ان کو بعض مواقع پر اس وقت دیکھا ہے کہ رات نے اپنے پردے ڈال دیئے تھے، اور تارے ڈھل گئے تھے، وہ اپنی محراب میں کھڑے تھے، داڑھی پکڑے ہوئے، مار گزیدہ کی طرح تڑپتے تھے، اور اس طرح روتے تھے کہ جیسے دل پر چوٹ لگی ہو، گویا میں سُن رہا ہوں اور وہ کہہ رہے ہیں، اے دنیا! اے دنیا! کیا مجھ سے چھیڑ کرنے چلی ہے، اور مجھ پر تیری نظر ہے؟ اس کی امید نہ کرنا، کسی اور کو فریب دے، میں نے تجھ کو ایسا چھوڑا ہے کہ کبھی تیرا نام بھی نہ لوں گا، تیری عمر مختصر، تیری زندگی بے وقعت، اور تیرا خطرہ بہت ہے، ہائے سامانِ سفر کس قدر کم ہے، سفر کتنے دور کا ہے، راستہ کتنا وحشت ناک ہے![1]

خلفاء کی زاہدانہ زندگی اور خاندان میں سے کسی کو جانشین نہ بنانا

ان خلفاء کے اخلاص، للّٰہیت، ان کی عظمت و انفرادیت کی کھلی ہوئی ایک دلیل یہ بھی کہ انھوں نے مؤسسینِ سلطنت اور دور اندیش، بلند حوصلہ

---

[1] صفۃ الصفوۃ ابن جوزی ص ۱۲۲

حکمرانوں کی طرح نہ تو اس بے پایاں دولت اور صدیوں کے اندوختہ سے جو سیلاب کی طرح فارس و روما سے امنڈتا ہوا چلا آرہا تھا، کوئی فائدہ حاصل کیا اور عیش و عشرت کی نہ سہی، فراغت و راحت کی زندگی گذاری، بلکہ اپنے مقتدیٰ اور محبوب کے نقش قدم پر چل کر عُسرت و تنگی اور زہد و ایثار کی زندگی گذاری، بلکہ وہ خلافت کے منصب پر متمکن ہونے سے پہلے زیادہ فارغ البال اور مطمئن تھے۔

جس طرح ان خلفاء نے زندگی بسر کی اس کے متعلق گبن (GIBBON) لکھتا ہے:-

"ابوبکرؓ، عمرؓ، اور عثمانؓ کی ہمّت و جرأت کی آزمائش رسول اللہؐ کے زمانے کے سخت حالات اور جنگوں کے ذریعہ ہوچکی تھی، اور جنّت کی بشارت نے انھیں دنیاوی لذّات اور خطرات سے لاپرواہ بنا دیا تھا، لیکن انھوں نے حکومت کی باگ ڈور اس وقت سنبھالی جب وہ سن رسیدہ ہوچکے تھے، اور دین اور انصاف ان کی نظروں میں حکومت سے زیادہ اہمیت حاصل کرچکا تھا، ان کی انتہائی سادہ زندگی ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی جو روئے زمین کے بادشاہوں کی شان و شوکت کے لئے تازیانہ کا حکم رکھتی تھی"[1]

---

[1] EDWARD GIBBON, THE DECLINE AND FALL OF ROMAN EMPIRE, LONDON 1911, Vol. V, P. 399

دوسرے یہ کہ ان میں سے کسی نے اختیار کے باوجود اپنے بیٹے یا قریب ترین فرد خاندان کو اپنا جانشین نہیں بنایا، بلکہ بالعکس انھوں نے ان کو خلافت کی ذمہ داری سے الگ رہنے کی ہدایت اور مسلمانوں کو ان کو منتخب نہ کرنے کی وصیت کی، جس کی بناء پر (فطرت، جذبۂ انسانی اور صدیوں نہیں ہزاروں برس کی حکومتوں، حکمرانوں کی روایات اور تجربوں کو سامنے رکھ کر) اس کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ وہ سرتاپا اخلاص، للّٰہیت ظاہراً و باطناً بے غرض و بے لوث تھے، اور ان کا خلافت کی ذمہ داری قبول کرنا محض رضائے الٰہی کی خاطر، دین کی اشاعت و استحکام اور فتنوں اور خطرات کے دروازے بند کرنے کے سوا کچھ نہ تھا ورنہ (جیسا کہ بعض مکاتبِ خیال کا خیال اور قول ہے) اگر انھوں نے خلافت اپنے ذاتی اغراض، جاہ طلبی اور مقصد براری کے لئے قبول کی تھی تو دنیا کا فائدہ اٹھائے بغیر اپنی عاقبت خراب کرنا "گناہ بے لذّت" کے سوا کچھ قرار نہیں پاتا، اور یہ کسی ذی ہوش آدمی کا کام نہیں ہو سکتا کہ وہ "کوہ کندن کاہ برآوردن" کے مرادف ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کا زُہد و ایثار اور احتیاط

ہم اس موقعہ پر ایک مثال حضرت ابوبکرؓ کی سیرت کی اور ایک حضرت عمرؓ کے واقعہ کی دینے پر اکتفا کریں گے جس کے بعد ہر ایسا شخص جس کی عقل و ضمیر کو

تعصب نے مغلوب نہیں کیا ہے، وہ خود ہی فیصلہ کرسکتا ہے۔

عہدِ صدّیقی کا مؤرخ لکھتا ہے:۔

"ایک روز حضرت ابوبکر صدّیق کی بیوی نے شیرینی کی فرمائش کی جواب دیا میرے پاس کچھ نہیں! انھوں نے کہا کہ اجازت ہو تو میں خرچ روزمرّہ میں سے کچھ درہم بچا کر جمع کروں، فرمایا جمع کرو، کچھ روز میں چند پیسے جمع ہوگئے تو حضرت ابوبکرؓ کو دیئے کہ شیرینی لادو پیسے لے کر کہا، معلوم ہوا کہ یہ خرچ ضروری سے زیادہ ہیں، لہذا بیت المال کا حق ہے چنانچہ وہ پیسے خزانہ میں جمع کر دیئے، اور اسی قدر اپنا وظیفہ کم کر دیا"[1]

حضرت حسنؒ راوی ہیں کہ "حضرت ابوبکرؓ کا آخری وقت ہوا تو فرمایا: عائشہؓ وہ اونٹنی جس کا ہم دودھ پیتے تھے، اور وہ لگن جس میں ہم کھانا کھاتے تھے، اور وہ چادر جو ہم استعمال کرتے تھے، یہ اس وقت کی بات ہے جب ہم مسلمانوں کا کام کرتے تھے، جب میرا انتقال ہو جائے تو اس سب کو عمرؓ کے پاس پہونچا دینا، جب حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہوا تو انھوں نے وہ چیزیں حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا: ابوبکرؓ تم پر خدا کی رحمت ہو تم نے اپنے بعد والے پر بڑا بوجھ ڈال دیا"[2]، یہ بھی آتا ہے کہ "جب آخر وقت ہوا تو فرمایا کہ میری فلاں زمین اس رقم کے معاوضہ میں بیت المال کی طرف منتقل کر دی جائے، جو میں اپنی خلافت میں بیت المال سے وصول کر چکا ہوں"[3]، ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "میرے مال میں سے

---

[1] کامل ابن اثیر ج ۲ صـ۴۲۳ (لیڈن ۶۸ – ۱۸۶۷)

[2] تاریخ الخلفاء صـ۸۰ مطبعۃ السعادۃ۔ مصر ۱۹۵۲ء [3] ایضاً صـ۸۱

آٹھ ہزار درہم لے کر بیت المال میں داخل کر دینا، اس لئے کہ اسی قدر مجھ پر صرف ہوئے تھے"۔

انتقال کے وقت فرمایا کہ "یہ دونوں کپڑے جو میرے جسم پر ہیں ان کو دھو ڈالنا اور اسی میں مجھے کفن دینا، نئے کپڑے کی مرنے والے کے مقابلہ میں زندہ رہنے والے کو زیادہ ضرورت ہے[1]"۔

حضرت عمرؓ کا سرکاری دورہ اور سفر شام

اب دوسری مثال حضرت عمرؓ کی پیش کی جاتی ہے، آپ نے بہت سی مملکتوں کے بادشاہوں اور بہت سی جمہوریتوں کے سربراہوں کے سرکاری دوروں کی روداد سنی ہوگی اور ان کے شاہانہ تزک و احتشام اور کر و فر کا تماشہ دیکھا ہوگا، چھٹی صدی عیسوی کے سب سے بڑے طاقتور فرمانروا حضرت عمرؓ کے سرکاری دورہ (سفر شام) کی روداد مؤرخ کی زبان سے سنئے، مولانا شبلیؒ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "الفاروق" میں ۱۶ھ کے سفر بیت المقدس کا حال بیان کرتے ہوئے مستند عربی تاریخوں کے حوالہ سے لکھتے ہیں:۔

"ناظرین کو انتظار ہوگا کہ فاروق اعظمؓ کا سفر اور سفر بھی وہ جس سے دشمنوں پر اسلامی جلال کا رعب بٹھانا مقصود تھا کس سروسامان سے ہوگا؟ لیکن یہاں نقارہ و نوبت، خدم و حشم، لاؤ لشکر ایک طرف معمولی ڈیرہ اور خیمہ تک نہ تھا، سواری میں گھوڑا تھا، اور چند مہاجرین و انصار ساتھ تھے،

---

[1] طبقات جلد ۳ صـ ۱۳۱

تاہم جہاں یہ آواز پہونچتی تھی کہ فاروق اعظمؓ نے مدینہ سے شام کا ارادہ کیا ہے، زمین دہل جاتی تھی۔

جابیہ میں دیر تک قیام رہا اور بیت المقدس کا معاہدہ بھی یہیں لکھا گیا، معاہدہ کی تکمیل کے بعد حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کا ارادہ کیا گھوڑا جو سواری میں تھا، اس کے سُم گھس کر تمام ہو گئے تھے، اور رُک رُک کر قدم رکھتا تھا حضرت عمرؓ دیکھ کر اتر پڑے، لوگوں نے ترکی نسل کا ایک عمدہ گھوڑا حاضر کیا، گھوڑا شوخ اور چالاک تھا، حضرت عمرؓ سوار ہوئے تو اُچھل کرنے لگا، فرمایا کمبخت یہ غرور کی چال تو نے کہاں سے سیکھی؟ یہ کہہ کر اُتر پڑے اور پیادہ پا چلے، بیت المقدس قریب آیا تو حضرت ابوعبیدہؓ اور سرداران فوج استقبال کو آئے، حضرت عمرؓ کا لباس اور سروسامان جس معمولی حیثیت کا تھا، اس کو دیکھ کر مسلمانوں کو شرم آتی تھی کہ عیسائی اپنے دل میں کیا کہیں گے، چنانچہ لوگوں نے ترکی گھوڑا اور عمدہ قیمتی پوشاک حاضر کی، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ خدا نے ہم کو جو عزت دی ہے وہ اسلام کی عزت ہے اور ہمارے لئے یہی بس ہے۔"

دوسرے سفر شام ۱۷ھ کا حال بھی سن لیجئے:۔

"حضرت عمرؓ نے شام کا قصد کیا، حضرت علیؓ کو مدینہ کی حکومت دی اور خود ایلہ کو روانہ ہوئے، یرفا ان کے غلام اور بہت سے صحابہؓ ساتھ تھے، ایلہ کے قریب پہونچے تو کسی مصلحت سے اپنی سواری غلام کو دی، اور خود اس کے اونٹ پر سوار ہوئے، راہ میں جو لوگ دیکھتے تھے،

پوچھتے تھے کہ امیر المؤمنین کہاں ہیں؟ فرماتے تمہارے آگے، اسی حیثیت سے ایلیہ میں آئے، یہاں دو ایک روز قیام کیا، گزی کا کرتہ جو زیب بدن تھا، کجاوہ کی رگڑ کھا کر پیچھے سے پھٹ گیا تھا، مرمت کے لئے ایلیہ کے پادری کے حوالہ کیا اس نے خود اپنے ہاتھ سے پیوند لگائے اور اس کے ساتھ ایک نیا کرتہ تیار کر کے پیش کیا، حضرت عمرؓ نے اپنا کرتہ پہن لیا اور کہا اس میں پسینہ خوب جذب ہوتا ہے"۔[1]

خلفائے ثلاثہ کے ساتھ سیدنا علی مرتضیٰ کا تعاون

جیسا کہ سید امیر علی نے لکھا ہے "رسول اللہ کی وفات کے بعد خلافت کے لئے حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب کو حضرت علیؓ نے اور رسول کے خاندان کے افراد نے بخوشی قبول کر لیا"[2] ولیم میور نے بھی اگرچہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے درمیان رسول اللہ کے ذاتی ترکہ کے متعلق غلط فہمی کا ذکر کیا ہے لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت علیؓ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں اسی طرح حاضر ہوتے رہے جس طرح دوسرے صحابہ، اور وہ قاضی القضاۃ کی خدمت بھی انجام دیتے رہے[3]، ولیم میور یہ بھی لکھتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے خطوط

---

[1] الفاروق ج ا ص ۱۴۲-۱۴۵ معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء، واقعہ تفصیل سے علامہ ابن کثیر کی مستند تاریخ "البدایہ والنہایہ" ج ۷، ص ۵۵-۶۰ اور "تاریخ طبری" میں ملاحظہ ہو۔

[2] A SHORT HISTORY OF SARACENS P. 21

[3] ANNALS OF EARLY CALIPHATE P. 65

عام طور پر حضرت علیؓ ہی لکھا کرتے تھے۔[۱]

"نہج البلاغہ" کا انگریزی ترجمہ جسے عالمی شیعہ مسلم انجمن نے طبع کیا ہے، اس کے مترجم عسکری جعفری نے اپنے مقدمہ میں اس کا ذکر کیا ہے کہ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے اور انھیں قبول بھی کرتے تھے، جب حضرت عمرؓ نے سلطنتِ روما سے جنگ کے موقعہ پر حضرت علیؓ کی رائے لی تو انھوں نے کہا کہ آپ یہیں موجود رہیں، اور کسی اور تجربہ کار جنرل کو کمانڈر بنا کر بھیجیں،[۲] اسی طرح فارس سے جنگ کے موقعہ پر حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کو میدانِ جنگ پر جانے سے منع کیا،[۳] حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کو جو صلاح دی تھی اس کی تصدیق "نہج البلاغۃ" میں شامل ہے، حضرت علیؓ کے خطبہ نمبر ۱۳۷ اور ۱۴۹ سے بھی ہوتی ہے۔[۴]

سید حسین نصر ایرانی کی شہادت

مغربی زبانوں میں اسلامیات پر متعدد کتابوں کے مصنّف اور ممتاز دانشور سید حسین نصر جو ایرانی النسل شیعہ اور مستند علمی مقام رکھتے ہیں، خلفاء راشدین اور صحابہ کرام کے خلوص اور خدمتِ اسلام کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اسلامی تاریخ کے اس عدیم المثال دور کے بعد چار خلفاءؓ (جنھیں سنّی خلفاء راشدین کے نام سے یاد کرتے ہیں) اور چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ (جنھیں شیعہ پہلا امام مانتے ہیں) حاکم ہوئے، اس زمانہ میں قرآنی تعلیمات

---

[۱] ایضاً ص ۱۲۳ [۲] PEAK OF ELOQUENCE, BOMBAY 1979, P. 57 -

[۳] ایضاً ص ۵۷ [۴] ایضاً ص ۲۶۰-۲۷۰

اور اُسوۂ رسول کو صرف انھیں حالات سے متعلق نہیں سمجھا گیا جو رسول اللہ کے زمانہ میں پیش آئے تھے بلکہ سرعت کے ساتھ بیرونِ عرب اسلام کی اشاعت سے پیش آنے والے نئے کوائف وحالات پر بھی نافذ کیا گیا، بازنطینی حکومت کے کچھ حصوں پر اسلامی قبضہ اور ساسانی حکومت کے زوال کے باعث بہت سے نئے مسائل سامنے آئے جنھیں حل کرنے کے لئے پہلے سے طے شدہ اصولوں سے کام لیا گیا، جن لوگوں نے یہ کام انجام دیا وہ اصحابِ رسولؐ تھے اور جن کا مقصد دنیوی مفاد کے بجائے اسلام کی خدمت تھی۔[۱]

سیدنا علی مرتضیٰؓ نے خلفائے ثلاثہ بالخصوص شیخین کو اپنا پورا تعاون دیا، بہت نازک موقعوں پر ان کے صائب مشورے بڑے مفید اور قیمتی ثابت ہوئے ان حضرات نے بھی آپ کے علم وفہم اور اصابتِ رائے کا بلند الفاظ میں اعتراف کیا ہے حضرت ابوبکرؓ کی وفات اور حضرت عمرؓ کی شہادت پر آپ نے اپنے جذبات وتاثرات کا جس طرح اظہار کیا اس سے ان مخلصانہ تعلقات کا پورا اظہار ہوتا ہے یہ دونوں خطبے جن میں ان کا اسلوب بیان، ان کی زبان اور ان کے ادبی وبلاغتی خصوصیات پوری طرح نمایاں ہیں کتب تاریخ میں دیکھے جا سکتے ہیں، یہاں طوالت کے خوف سے ان کو نقل نہیں کیا جاتا۔[۲]

حضرت عثمانؓ کے محاصرہ کے دوران پانی روک دیا گیا تھا حضرت علیؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو پانی کی تین مشکیں بھیج دیں، ان کے لے جانے کے سلسلہ میں بنی ہاشم کے

---

[۱] سید حسین نصر آئیڈیلز اینڈ ریلیٹیز آف اسلام (IDEALS AND REALITIES OF ISLAM) بوسٹن (BOSTON) ۱۹۶۷ء ص ۱۰۰-۱۰۱

[۲] ملاحظہ ہو "الریاض النضرۃ فی فضائل العشرۃ" تالیف محب الدین طبری (م ۶۹۴ھ) مخطوطہ کتب خانہ ندوۃ العلماء ۱۷۸۴، ورق ۱۲۶، ۱۲۷، نیز ۱۸۷، ۱۸۸، "سیرۃ الصدیق" اردو میں حضرت ابوبکرؓ کے متعلق حضرت علیؓ کا پورا خطبہ ترجمے کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے، ص ۱۴۵ تا ص ۱۵۱، نیز طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۳۷۰ (دار صادر بیروت)

کئی تعلق والے زخمی ہوئے، حضرت علی رضؓ نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سے کہا کہ اپنی تلواریں لے کر عثمانؓ کے دروازہ پر کھڑے ہو جاؤ اور کسی کو ان تک پہونچنے نہ دو۔

جب حضرت عثمانؓ پر باغیوں نے نرغہ کیا اور ان کے مکان کا محاصرہ کر لیا تو حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ اور اپنے آزاد کردہ غلام قنبر کو حضرت عثمانؓ کی حفاظت پر مامور کیا، اس مدافعت میں حضرت حسنؓ زخمی بھی ہوئے، سارا بدن خون سے رنگین ہو گیا، قنبر کے سر پر چوٹیں آئیں لیکن باغی اس دروازہ سے داخل نہ ہو سکے جہاں حضرت حسنؓ کا پہرہ تھا، وہ دوسری دیوار پھاند کر اندر پہونچ گئے اور حضرت عثمانؓ کو بحالتِ تلاوت شہید کر دیا۔[1]

صحابہؓ اور اہل بیت کے باہمی تعلقات

قرآن مجید نے صحابہؓ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ"[2] (وہ کافروں کے حق میں تو سخت ہیں اور آپس میں رحم دل) ان کی زندگی، ان کے آپس کے تعلقات، ان کا ایک دوسرے کے ساتھ سلوک، باہمی محبت، اکرام و احترام، پاسداری اور ادائے حقوق کے واقعات اس نصِ قرآنی کی تائید کرتے ہیں، سید امیر علی نے بالکل صحیح لکھا کہ "رسولؐ کے صحابہ کے دین پر پختگی خود رسولؐ کی حقانیت اور اپنے مقصد کے ساتھ خلوص کا سب سے بڑا ثبوت ہے"۔[3]

اس کے خلاف جو بھی بیان کیا گیا ہے یا بیان کیا جائے، وہ قرآن کی تکذیب، تاریخ کی تغلیط اور تربیتِ نبوی صلعم کے بارے میں بدگمانی اور تشکیک کے مرادف ہے، یہاں پر چند واقعات لکھے جاتے ہیں۔

بخاری کی روایت ہے عقبہ بن الحارث کہتے ہیں کہ "حضرت ابوبکرؓ نے عصر کی نماز

---

۱ ملاحظہ ہو تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۱۶۰، نیز مقدمۂ انگریزی ترجمۂ "نہج البلاغۃ" "PEAK OF ELOQUENCE" از مسٹر عسکری جعفری بمبئی ۱۹۷۹ء ص ۶۱۔ ناشر: ISLAMIC SEMINARY. U. S. A.

۲ سورۃ الفتح۔ ۲۹

۳ AMIR ALI THE SPIRIT OF ISLAM, LONDON, 1922 P. 22.

پڑھی، پھر باہر نکل کر ٹہلنے لگے، انھوں نے حضرت حسنؓ کو دیکھا کہ بچوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں، حضرت ابوبکرؓ نے ان کو اپنے کاندھے پر بٹھالیا اور کہا میرا باپ قربان ہو، یہ آنحضرتؐ سے مشابہ ہے علیؓ سے مشابہ نہیں، حضرت علیؓ سن رہے تھے، اور ہنس رہے تھے۔[1]

حضرت حسینؓ راوی ہیں کہ "ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے مجھ سے کہا کہ تم ہمارے پاس آتے اور بیٹھتے نہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں گھر پر گیا اس وقت وہاں تخلیہ ہو رہا تھا، دروازہ پر ان کے فرزند عبداللہ انتظار میں بیٹھے تھے، میں یہ دیکھ کر واپس چلا آیا، اس کے بعد جب ملاقات ہوئی تو فرمایا بیٹے تم ہمارے پاس آئے نہیں؟ میں نے کہا میں آیا تھا لیکن اس وقت تنہائی تھی، میں نے دیکھا کہ خود آپ کے فرزند عبداللہ اجازت کے منتظر ہیں، میں واپس آگیا، فرمایا کہ عبداللہ بن عمرؓ کو اجازت ہوتی نہ ہوتی تم اندر آسکتے تھے، ہمارے دل و دماغ میں ایمان کی جو تخم ریزی ہوئی، وہ اللہ کا احسان ہے پھر تمہارے گھرانے ہی کا فیض ہے، یہ کہہ کر شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔"[2]

ابن سعد حضرت جعفر صادق سے روایت کرتے ہیں وہ حضرت محمد باقر سے وہ امام زین العابدین سے کہ "ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے پاس یمن کے حُلّے آئے[3] حضرت عمرؓ نے لوگوں میں تقسیم کر دیئے، وہ یہ پوشاک پہن کر مسجد نبوی میں آئے، آپ قبر شریف اور منبر کے درمیان بیٹھے تھے، لوگ آتے تھے سلام کرتے تھے دعا دیتے تھے، اتنے میں حسنؓ و حسینؓ اپنی والدہ کے مکان سے (جو مسجد ہی میں تھا) نکل کر آئے ان کے جسم پر کوئی حُلّہ نہیں تھا،

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۰۲ کتاب بدء الخلق، باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ مسند احمد، نسائی اور طبقات ابن سعد۔ [2] کنز العمال ج ۷ ص ۱۰۵، الاصابہ جلد ۱ ص ۳۳۳ بسند صحیح۔

[3] اگر ایک ہی کپڑے کا پائجامہ اور قمیص ہو اور کپڑا قیمتی ہو تو حُلّہ کہتے ہیں، یہ قدیم عربوں میں وہی درجہ رکھتا تھا جو اس زمانہ میں سوٹ کا ہے۔

حضرت عمرؓ افسردہ اور اداس بیٹھے ہوئے تھے، لوگوں نے پوچھا کیا بات ہے؟ آپ نے فرمایا میں ان بچوں کی وجہ سے مغموم ہوں کہ ان کے بدن کے مطابق کوئی حلّہ نہیں تھا، سب بڑی عمر والوں کے لئے تھے، پھر آپ نے یمن اپنے عامل (والی) کو لکھا کہ حسنؓ و حسینؓ کے لئے دو حلّے بھیجو اور جلدی کرو، اس نے دونوں کی پوشاکیں بھیجیں، آپ نے ان دونوں کو پہنایا تب اطمینان ہوا۔[1]

مولانا شبلیؒ "الفاروق" میں متعلقین جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس و لحاظ" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:۔

"(حضرت عمرؓ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تعلق کا نہایت پاس کرتے تھے، جب صحابہ وغیرہ کے روزینے مقرر کرنے چاہے تو عبدالرحمن بن عوفؓ وغیرہ کی رائے تھی کہ حضرت عمرؓ مقدّم رکھے جائیں، لیکن حضرت عمرؓ نے انکار کیا اور کہا کہ ترتیب مدارج میں سب سے مقدم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تعلّقاتِ قُرب و بُعد کا لحاظ ہے، چنانچہ سب سے پہلے قبیلہ بنی ہاشم سے شروع کیا اور اس میں بھی حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے ناموں سے ابتداء کی، اپنے قبیلہ بنی عدی کو پانچویں درجہ میں رکھا، چنانچہ اسی ترتیب سے سب کے نام لکھے گئے، تنخواہوں کی مقدار میں بھی اسی کا لحاظ رکھا، سب سے زیادہ تنخواہیں جن لوگوں کی تھیں وہ اصحاب بدر تھے حضرت امام حسن وحسین علیہما السلام اگرچہ اس گروہ میں نہ تھے، لیکن ان کی تنخواہیں اسی حساب سے مقرر کیں۔"[2]

---

[1] کنز العمال ج ۷، ص ۱۰۶ از ابن سعد ۱۹۵۶ء

[2] "الفاروق" جلد دوم ص ۲۶۹ معارف پریس اعظم گڑھ (بحوالہ کتاب الخراج از امام ابویوسف ص ۲۴-۲۵)

"حضرت عمرؓ بڑی بڑی مہمات میں حضرت علیؓ سے مشورہ کے بغیر کام نہیں کرتے تھے، اور حضرت علیؓ بھی نہایت دوستانہ و مخلصانہ مشورہ دیتے تھے، نہاوند کے معرکہ میں ان کو سپہ سالار بھی بنانا چاہا تھا لیکن انھوں نے منظور نہیں کیا، بیت المقدس گئے تو کاروبار خلافت انھیں کے ہاتھ میں دے گئے، اتحاد و یگانگت کا آخری مرتبہ یہ تھا کہ حضرت علیؓ نے حضرت ام کلثومؓ کو جو فاطمہ زہراؓ کے بطن سے تھیں ان کے عقد میں دے دیا"[1]

جہاں تک شیر خدا حضرت علیؓ کا تعلق ہے ان کا اپنی رضا و رغبت سے اپنی صاحبزادی ام کلثومؓ کو دوسری بیویوں کی موجودگی میں اس سن و سال میں حضرت عمرؓ کے عقد میں دینا، اور اپنے تین صاحبزادوں کے نام ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ رکھنا[2] اس الفت و محبت اور اعتماد کی واضح مثال ہے، ایسی اور مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں، لیکن ہم اختصاراً اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

مولانا حالی کے موئے قلم سے عہدِ صحابہؓ کی دلکش تصویر

ان خصوصیات کی بناء پر یہ پہلا اسلامی معاشرہ جس کی بنیاد صحبتِ نبویؐ، تربیتِ ایمانی اور تعلیماتِ قرآنی پر پڑی تھی، ایک بے خار انسانی گلدستہ بن گیا جس کا ہر پھول اور ہر پتی اس کے لئے باعث زینت تھی، مختلف قبائل مختلف خاندانوں

---

[1] حضرت ام کلثومؓ کے ساتھ عقد کی بحث، اس کا ثبوت اور اس پر تاریخی، علمی و کلامی محاکمہ نواب محسن الملک کی معرکۃ الآراء کتاب "آیات بیّنات" (حصہ اول ص ۱۲۷-۱۶۴ مطبع مرزاپور ۱۸۷۰ء) میں دیکھی جائے۔ [2] العبقریات (از عباس محمود العقاد مصری) عبقریۃ الامام ص ۹۵۸ طبع دار الفتوح قاہرہ۔

اور مختلف حیثیتوں کے افراد ایک خوش اسلوب متحد القلوب خاندان میں تبدیل ہو گئے، اور اسلام کی انقلاب انگیز تعلیم اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معجز آثر صحبت نے ان کو شیر وشکر بنا دیا۔

اس موقعہ پر راقم سطور کے قلم سے خواجہ الطاف حسین حالی کی شہرۂ آفاق مسدس کا ایک اقتباس نقل کئے بغیر رہا نہیں جاتا جس میں صحابۂ کرام کے اس معاشرہ کی بولتی ہوئی تصویر کھینچی گئی ہے، یہ تصویر مبنی بر حقیقت ہونے کے ساتھ ایسی دلکش و دلآویز ہے کہ اس کو پوری نسل انسانی کے وسیع اور ضخیم مرقع میں پیغمبروں کی سیرت و تاریخ کے بعد سب سے پہلی اور اونچی جگہ دینی چاہیئے، مولانا حالیؒ صحابہ کرامؓ اور خلافتِ راشدہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

جب امت کو سب مل چکی حق کی نعمت ادا کر چکی فرض اپنا رسالت
رہی حق پہ باقی نہ بندوں کی حجّت نبیؐ نے کیا خلق سے قصدِ رحلت
تو اسلام کی وارث اک قوم چھوڑی
کہ دنیا میں جس کی مثالیں ہیں تھوڑی

سب اسلام کے حکم بردار بندے سب اسلامیوں کے مددگار بندے
خدا اور نبیؐ کے وفادار بندے یتیموں کے رانڈوں کے غمخوار بندے
رہ کفر و باطل سے بیزار سارے
نشہ میں مئے حق کے سرشار سارے

جہالت کی رسمیں مٹا دینے والے کہانت کی بنیاد ڈھا دینے والے
سر احکامِ دیں پر جھکا دینے والے خدا کے لئے گھر لٹا دینے والے

ہر آفت میں سینہ سپر کرنے والے
فقط ایک اللہ سے ڈرنے والے

اگر اختلاف ان میں باہم دگر تھا — تو بالکل مدار اس کا اخلاص پر تھا
جھگڑتے تھے لیکن نہ جھگڑوں میں شر تھا — خلاف آشتی سے خوش آئندہ تر تھا

یہ تھی موج پہلی اُس آزادگی کی
ہرا جس سے ہونے کو تھا باغِ گیتی

نہ کھانوں میں تھی واں تکلّف کی کلفت — نہ پوشش سے مقصود تھی زیب و زینت
امیر اور لشکر کی تھی ایک صورت — فقیر اور غنی سب کی تھی ایک حالت

لگایا تھا مالی نے اک باغ ایسا
نہ تھا جس میں چھوٹا بڑا کوئی پودا

خلیفہ تھے امّت کے ایسے نگہباں — ہو گلّہ کا جیسے نگہبان چوپاں
سمجھتے تھے ذِمّی و مسلم کو یکساں — نہ تھا عبد و حُر میں تفاوت نمایاں

کنیز اور بانو تھیں آپس میں ایسی
زمانہ میں ماں جائی بہنیں ہوں جیسی

رہِ حق میں تھی دوڑ اور بھاگ اُن کی — فقط حق پہ تھی جس سے تھی لاگ اُن کی
بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ ان کی — شریعت کے قبضہ میں تھی باگ اُن کی

جہاں کر دیا نرم نرما گئے وہ
جہاں کر دیا گرم گرما گئے وہ

کفایت جہاں چاہئے واں کفایت — سخاوت جہاں چاہئے واں سخاوت

بچی اور تلی دشمنی اور محبّت — نہ بے وجہ الفت نہ بے وجہ نفرت

جھکا حق سے جو جھک گئے اس سے وہ بھی

رُکا حق سے جو رُک گئے اس سے وہ بھی[1]

فطرت انسانی کی اصلاح پذیری کی دلیل اور انسانیت کے لئے سرمایۂ ناز

قرآن مجید، احادیث صحیحہ اور مستند تاریخ کی روشنی میں اسلامی معاشرہ کے جو خد و خال اس کا جو سراپا اور نقشہ اور اس سے آگے بڑھ کر اس کا جو مزاج و مذاق سامنے آتا ہے، اس سے نہ صرف اوّلین مسلمانوں اور آغوش نبوت کے پروردہ اور درسگاہ نبوی و قرآنی کے تربیت یافتہ لوگوں کی، بلکہ ایک ایسی بڑی تعداد میں افراد انسانی کی ایک حسین اور دلکش تصویر سامنے آتی ہے جس سے بہت کم تعداد میں بھی اور صدیوں کے فرق اور مکان و زمان کے تفاوت سے بھی کوئی ایسی معیاری اور مثالی جماعت نظر نہیں آتی، اس سے انسانی فطرت کی خیر قبول کرنے کی صلاحیت، اس کی ترقی، پاکیزگی، بلند پروازی کے ایسے وسیع امکانات (جہاں تک انسانوں کی ذہانت پہونچنی مشکل ہے) مخلص اور مؤیّد من اللہ مصلحین و مُربّیوں کی کوشش و محنت کی کامیابی اور اس کے عمیق اور دیرپا اثرات کا روشن ثبوت ملتا ہے، اور انسانیت کو خود اپنے اوپر ناز کرنے اور ہر دور کے انسانوں کو فخر و مباہات کا حق حاصل ہوتا ہے کہ ان کی جنس اور نوع میں ایسے بلند پایہ انسان پیدا ہوئے جن میں ہر ایک بقول اقبال۔ ع

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولیٰ صفات

[1] "مدّ و جزر اسلام" یعنی مسدس حالی" صفحہ ۳۴-۳۸ راجہ رام کمار پریس بک ڈپو لکھنؤ، ۱۹۵۶ء

کا مصداق تھا، اس سے فرد انسانی احساس کہتری، مردم بیزاری اور مایوسی کے امراض سے شفا پاتا ہے، صحیح خطوط پر کام کرنے والوں کا حوصلہ بلند ہوتا ہے اور انبیاء مرسلین (صلوات اللہ علیہم) کی عمومیت کے ساتھ اور سید المرسلین خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی کی خصوصیت کے ساتھ عظمت وعزت راسخ ہوتی ہے، آپ کی تعلیم وتربیت کے نتائج کو دیکھ کر ایمان بالغیب ایمان شہودی بن جاتا ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے بہت صحیح لکھا ہے کہ :۔

"ان بشری لغزشوں اور کوتاہیوں کے باوجود جو انسانیت کا لازمہ ہیں، مجموعی حیثیت سے انبیاء علیہم السلام کے علاوہ افراد انسانی کا کوئی مجموعہ اور انسانوں کی کوئی نسل صحابہ کرامؓ سے بہتر سیرت وکردار کی نظر نہیں آتی، اگر ان کی زندگی میں کہیں کہیں کچھ ہلکے سے دھبے اور داغ نظر آتے ہیں تو اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے سفید کپڑے میں کہیں کچھ تھوڑی سی سیاہی نظر آجائے، یہ عیب چینیوں کا قصور ہے کہ ان کو اس کپڑے میں سیاہی کا نقطہ تو نظر آیا اور اس کپڑے کی سفیدی نظر نہ آئی، دوسری جماعتوں کا تو حال یہ ہے کہ ان کا سارا نامۂ اعمال سیاہ نظر آتا ہے کہیں کہیں سفیدی نظر آتی ہے۔"[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی براہ راست تربیت یافتہ نسل اور اسلام کے مثالی عہد کی وہ تاریک و مکروہ تصویر جو فرقہ اثنا عشریہ پیش کرتا ہے لیکن اس کے بالکل برخلاف اپنے کو مسلمان اور اسی نبیؐ کی امت کہلانے

---

[1] ملاحظہ ہو "منہاج السنۃ" حصہ ۳ ص۲۴۲

والوں کا ایک فرقہ (امامیہ اثنا عشریہ) اس معاشرہ اور عہد کی ایک دوسری تصویر پیش کرتا ہے، جو ایک طرف سید الانبیاء صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی کوششوں کی ایسی ناکامی اور صحبت و تربیت کی ایسی بے اثری کا اظہار کرتی ہے، جو شاید دنیا کے کسی ایسے مخلص مؤثر اور ماہر مُعلّم و مُربّی کے حصہ میں کبھی نہیں آئی، جو نہ مامور من اللہ تھا، نہ مُؤیّد من السماء، نہ مورد وحی و الطاف الٰہی، نہ مالک اوصاف و کمالات لامتناہی بلکہ انسانوں کی زود فراموشی، طوطا چشمی، بے وفائی، حق پوشی، نفسانیت، حُبّ جاہ اور اپنے اغراض دنیّہ کے لئے ہر طرح کی کوششوں، سازشوں، تحریفات، افتراءات سے کام لینے کو جائز سمجھنے کی ایسی مکروہ تصویر پیش کرتی ہے، جو نہ صرف اصلاحی و تربیتی کوششوں کے انجام سے بلکہ پوری انسانیت کی صلاحیت، اس کی قسمت اور مستقبل سے مایوس کر دیتی ہے۔

ان کے نزدیک محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تئیس ۲۳ سالہ کوششوں کا نتیجہ صرف تین ۳ ہستیاں (اور بعض روایات کے مطابق چار تھیں) جو آپ کی وفات کے بعد بھی اسلام پر قائم رہیں، باقی سب نے (معاذ اللہ) آپ کی آنکھ بند ہوتے ہی اسلام سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا اور آپ کی صحبت و تربیت کو دنیا کے سامنے ناکام ثابت کیا[۱]، فرقہ اثنا عشریہ کی معتبر کتاب جس کو وہ اصحّ الکتب مانتے ہیں "الجامع الکافی"

---

[۱] سید الانبیاء والمرسلین علیہ الصلاۃ والسلام کی تربیت و صحبت کی تاثیر اور انقلاب انگیزی کے تذکرہ میں ان کی امت کے ان افراد کی ہدایت و تاثیر کا ذکر کرنا (جن کو جو کچھ ملا وہ آپ ہی کے طفیل اور صدقہ میں ملا) ایک طرح کی بے ادبی اور بد ذوقی ہے، ورنہ یہاں مختلف عہد کے ان اولیائے کرام اور ہادیانِ طریق کے ایسے واقعات بیان کئے جاتے، جن سے معلوم ہوتا کہ جن پر

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

کے آخری حصہ "کتاب الروضۃ" میں امام ابوجعفر (امام باقر) کا ارشاد نقل کیا گیا ہے:

کان الناس علی ردۃ بعد النبی	لوگوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ
صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم	وسلم کے بعد ارتداد اختیار کیا اس سے
الا ثلاثۃ، فقلت ومن	صرف تین آدمی مستثنیٰ ہیں، راوی کہتا
الثلاثۃ؟ فقال المقداد بن	ہے، میں نے عرض کیا وہ تین کون ہیں؟
الأسود وأبوذر الغفاری	فرمایا مقداد بن اسودؓ، ابوذر غفاریؓ
وسلمان الفارسی رحمۃ اللہ	وسلمان فارسیؓ، اللہ کی رحمتیں اور
علیہم وبرکاتہ[1]۔	برکتیں ان پر ہوں۔

علامہ خمینی کے ارشادات

ایران کے موجودہ داعیِ انقلاب اور مؤسس "حکومت اسلامی"

(باقی ص۴۲ کا) ان کی ایک بار نظر پڑ گئی وہ کندن بن گیا، سالہا سال کے جرائم پیشہ اور بدنام زمانہ لوگوں نے اگر ایک بار ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا تو آخر دم تک وہ راسخ العقیدہ، گناہوں سے مجتنب اور متقی و پرہیزگار رہے، اگر کبھی کسی ایسے آدمی کا (جس کے سایہ سے لوگ بھاگتے تھے، اور اس کی اصلاح سے مایوس تھے) اتفاقاً بستر ایک رات ان کے بستر کے پاس رہا تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ عابد و شب بیدار بن گیا اور عمر بھر اس کا یہی رنگ رہا، اس طرح کے واقعات عہد رسالت سے صدیوں بعد تک ہندوستان جیسے دور دراز ملکوں میں پیش آتے رہے، اس کی مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" (۱-۲) "القول الجلی فی کرامات السید محمد علی" "کاروان ایمان وعزیمت" "جب ایمان کی بہار آئی" وغیرہ [1] فروع کافی جلد سوم کتاب الروضۃ ص۱۱۵ طبع لکھنؤ، ایک روایت کے مطابق عمار بن یاسرؓ بھی اسی فہرست میں ہیں۔

نائبِ امامِ غائب آیت اللہ روح اللہ خمینی صاحب اپنی فارسی کتاب "کشف الاسرار" میں صحابہ کرامؓ کو ایسے اوصاف سے یاد کرتے ہیں، جو ان کو پکّا دنیا پرست، ناخدا ترس، جری و گستاخ، قرآن میں تحریف کرنے والا اور نتیجۃً کافر ثابت کرتے ہیں، وہ کشف الاسرار میں لکھتے ہیں:۔

آنکہ ممکن بود در صورتیکہ امام را	وہ لوگ (صحابہؓ) جو سوائے دنیا اور
در قرآن ثبت می کردند آنہا نیکہ	حصولِ حکومت کے اسلام اور قرآن
جز برائے دنیا و ریاست با اسلام	سے سروکار نہیں رکھتے تھے جنھوں نے
و قرآن سروکار نداشتند و قرآن	قرآن کو اپنی نیّاتِ فاسدہ کی تکمیل کا
را وسیلۂ اجرائے نیّات فاسدہ خود	محض وسیلہ بنایا تھا، ان کے لئے
کردہ بودند آں آیات را از قرآن	ان آیات کا (جو حضرت علیؓ کی خلافت
بردارند و کتاب آسمانی را تحریف	بلافصل اور ائمہ کی امامت پر دال
کنند و برائے ہمیشہ قرآن را از نظر	تھیں) قرآن مجید سے نکال دینا،
جہانیاں بیندازند تا روز قیامت	کتاب آسمانی کا تحریف کرنا اور
ایں ننگ برائے مسلمانہا و قرآن	ہمیشہ کے لئے قرآن کو دنیا والوں
آنہا بماند و ہما عیبے را کہ مسلمانان	کی نگاہ سے اس طرح مستور بنا دینا کہ
بکتاب یہود و نصاریٰ می گرفتند	قیامت کے دن یہ ننگ و عار مسلمانوں
عیناً برائے خود اینہا ثابت شود۔[1]	اور قرآن کے حق میں باقی رہے آسان
	تھا، تحریف کا وہ عیب جو مسلمان

---

[1] "کشف الاسرار" ص۱۱۴ کتاب پر مطبع اور سنہ کا اندراج نہیں ہے مگر یہ کتاب خمینی صاحب کی تصنیفات میں شامل ہے، سید اسعد گیلانی کی کتاب "امام خمینی دعوت تحریک اور افکار" میں اس کو امام خمینی کی تصنیفات میں درج کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ص۶۵۔

یہود و نصاریٰ پر لگاتے ہیں، ان
صحابہؓ پر ثابت ہے۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

آنکہ فرضاً در قرآن اسم امام را
ہم تعیین می کرد، از کجا کہ خلاف
بین مسلمانہا واقع نمی شد آنہا نیکہ
سالہا در طمع ریاست خود را بدین
پیغمبر چسپاندہ بودند و دستہ بندیہا
می کردند، ممکن نبود بگفتۂ قرآن
از کار خود دست بردارند، با ہر حیلہ
بود کار خود را انجام می دادند، بلکہ
شاید دریں صورت خلاف بین
مسلمانہا طورے می شد کہ بانہدام
اصل اسلام منتہی می شد، زیرا کہ
ممکن بود آنہا کہ در صدد ریاست
بودند چوں دیدند کہ باسم اسلام
نمی شود بمقصود خود برسند یکدہ حزبے
برضد اسلام تشکیل می دادند۔[1]

فرض کیجئے اگر قرآن مجید میں امام کے
نام کا تعیّن بھی کر دیا جاتا تو یہ نتیجہ
کہاں سے نکالا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں
کے درمیان اختلاف واقع نہ ہوتا،
وہ لوگ جنھوں نے سالہا سال سے
حکومت و ریاست کی طمع میں اپنے کو
پیغمبر کے دین کے ساتھ چپکا رکھا تھا
اور اس کے لئے جماعت سازی اور
مدت سے ساز باز کر رہے تھے، ان کے
لئے یہ ممکن نہ تھا کہ قرآن مجید کے
فرمان کی وجہ سے اپنے مقصد سے
دستبردار ہو جاتے، وہ ہر تدبیر سے
اپنا کام نکال لیتے بلکہ شاید اس صورت
میں مسلمانوں کے درمیان ایسا اختلاف
پیدا ہوتا کہ دین کی بنیاد ہی منہدم

---

[1] کشف الاسرار ص ۱۱۳-۱۱۴

ہو جاتی اس لئے کہ ممکن تھا کہ
جو لوگ اپنی حکومت کی فکر میں تھے
جب وہ دیکھتے کہ یہ کام اسلام کے
نام سے اور اس کے ذریعہ سے نہیں
ہو سکتا تو اپنا مقصد حاصل کرنے
کے لئے اسلام ہی کے خلاف گروہ
بندی کرتے اور کھل کر میدان میں آجاتے۔

اس کے علاوہ حضرات شیخین، ذوالنورین، عام صحابہ کرامؓ کے بارے میں خمینی صاحب کے فرمودات (جن کو نقل کرنے کا یارا نہیں) ان کی فارسی کتاب "کشف الاسرار" میں دیکھے جائیں یا مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کی کتاب "ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت" میں ملاحظہ فرمائے جائیں، ان کا یہاں اس سے زیادہ نقل کرنا نہ ضروری ہے نہ ممکن۔

نواب محسن الملک کا بصیرت افروز تبصرہ

صحابہ کرامؓ کے بارے میں اس فرقہ کے عقیدے اور رویّے کو دیکھ کر نواب محسن الملک[1]

---

[1] نواب محسن الدولہ محسن الملک منیر نواز جنگ سید مہدی علی ابن سید ضامن علی حسینی (۱۲۵۳ھ-۱۳۲۵ھ) اس دور کے ممتاز ترین فضلائے عالی دماغ اور ہندوستان کی جدید تعلیم یافتہ نسل کے محسنوں اور معماروں میں سے تھے، اپنے مطالعہ اور فطری سلامتِ طبع اور غور و فکر کی صلاحیت کی بناء پر سنّی مسلک اختیار کیا، نواب مختار الملک کی دعوت پر ۱۲۹۱ھ میں حیدرآباد گئے اور اعلیٰ عہدے پر (باقی صفحہ ۵۲ پر)

(مولوی سید محمد مہدی علی صاحب) نے "آیات بیّنات" میں جو کچھ لکھا ہے اس پر اضافہ اور اس سے بہتر طریقہ پر اس نفسیاتی و ذہنی ردِ عمل کا اظہار آسان نہیں، جو ایک سلیم الطبع انسان پر اس سے واقف ہونے کے بعد ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"حقیقت یہ ہے کہ جو اعتقاد شیعوں کا یہ نسبت صحابہؓ کے ہے اس سے الزام آپؐ کی نبوت پر آتا ہے، اور سننے والے کو مذہب اسلام پر شبہ ہوتا ہے، اس لئے کہ جب کوئی اس امر پر یقین کرلے کہ جو لوگ حضرتؐ پر ایمان لائے، ان کے دلوں پر کچھ اثر ایمان و اسلام کا نہ تھا اور وہ صرف ظاہر میں مسلمان او رعیاذاً باللہ باطن میں کافر تھے، یہ حضرت کے انتقال کرتے ہی وہ اس سے پھر گئے، وہ حضرت کی نبوت کی تصدیق کر نہیں سکتا، اور کہہ سکتا ہے کہ حضرت اگر سچے نبی ہوتے تو کچھ نہ کچھ ان کی ہدایت میں تاثیر ہوتی اور کوئی نہ کوئی دل سے ان پر ایمان لایا ہوتا، اور منجملہ ہزاروں، لاکھوں، آدمیوں کے جو ان پر ایمان لائے سَو دو سَو آدمی تو ایمان پر ثابت قدم رہتے، اگر صحابہ کرامؓ تمہارے عقائد باطلہ کے موافق اسلام اور ایمان میں

(باقی صفحہ ۵۱ کا) سرفراز ہوئے، ریاست میں بڑی دور رس اصلاحات کیں اور اپنی انتظامی و ذہنی صلاحیت کا ثبوت دیا ۱۳۰۵ھ میں انگلستان کا سفر کیا، وہاں کے تعلیمی مرکزوں کو دیکھا سرسید کی زندگی میں ان کے دست راست رہے ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ء) میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ (M.A.O. COLLEGE) اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری منتخب ہوئے جس پر حین حیات فائز رہے، ان کے زمانہ میں کالج نے ہر حیثیت سے ترقی کی۔

نواب محسن الملک بڑی طاقتور شخصیت کے مالک تھے سحر بیان مقرر اور پُر زور لکھنے والے تھے، ان کی کتاب "آیات بینات" اپنے موضوع پر ایک معرکۃ الآراء کتاب ہے۔

کامل نہ تھے، تو وہ لوگ کون سے ہیں، جن پر حضرت کی ہدایت کا اثر ہوا، اور ویسے لوگ کتنے ہیں؟ جن کو حضرت کی نبوت سے فائدہ ہوا، اگر اصحاب نبی سوائے معدودے چند کے بقول تمہارے سب کے سب عیاذاً باللہ منافق اور مرتد تھے تو دین اسلام کو کس نے قبول کیا؟ اور پیغمبر صاحب کی تعلیم و تلقین سے کس کو نفع پہونچا؟"[1]

امام شعبی کا قول

امام شعبی (م سنہ ۱۱۰ھ) نے بڑے نکتہ کی بات فرمائی کہ یہود و نصاریٰ، اہلِ تشیع کے مقابلہ میں اپنے پیغمبر کے زیادہ مرتبہ شناس اور قدرداں ہیں، یہودیوں سے پوچھا گیا، تمہاری ملت میں سب سے بہتر کون لوگ ہیں؟ انھوں نے کہا حضرت موسیٰؑ کے ساتھی، ان کے اصحاب! عیسائیوں سے پوچھا گیا تمہاری ملت میں سب سے بہتر کون ہیں؟ انھوں نے کہا عیسیٰؑ کے حواری! شیعہ صاحبان سے پوچھا گیا تمہاری ملت میں سب سے بدتر کون لوگ ہیں؟ انھوں نے کہا کہ اصحابِ نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم۔[2]

دنیا دار اور ناخدا ترس طالبین ریاست و حکومت پر قیاس

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ایرانی نژاد حضرات نے صحابہ کرامؓ اور تربیت یافتگانِ نبویؐ کو بانیانِ سلطنت، طالع آزما، جاہ و سلطنت کے

---

[1] "آیات بینات" حصہ اول صفحہ ۶۷ طبع مرزاپور ۱۸۶۷ء [2] منہاج السنۃ حصہ اول صفحہ ۶

بندوں اور مال و دولت کے حریصوں پر قیاس کیا جن کا نمونہ پہلوی، کیانی اور بعد میں صفوی، قاچاری، شاہانِ ایران کی شکل میں ان کے سامنے تھا، اور اگر یہ روایت صحیح ہے کہ خمینی صاحب کے جدامجد اودھ سے ایران منتقل ہوئے تھے، تو انھوں نے صحابہ کرامؓ کو تعلقداروں، زمینداروں اور ہوشیار اور کہنہ مشق مقدمہ بازوں اور جعل سازوں پر قیاس کیا جو زر، زمین، زن کے لئے ہر طرح کے وسائل و مساعی کو جائز اور ضروری سمجھتے ہیں۔

"ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدَىٰ"[1] (ان کے علم کی یہی انتہا ہے، تمہارا پروردگار اس کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کے رستہ سے بھٹک گیا، اور وہ خوب واقف ہے اس سے جس نے ہدایت پائی)

خاندان اور اہل قرابت کے بارہ میں اسوۂ نبویؐ

ہم نے ایسے دین کے لئے جو پوری نوع انسانی کو مخاطب کرتا اور اس کو اعلیٰ اخلاق و کردار اور بنیادی اصلاح و انقلاب کی دعوت دیتا ہو، دوسری شرط یہ قرار دی تھی کہ اس دین کے داعیِ اوّل کا مقصود، قدیم بانیانِ سلطنت اور عام سیاسی قائدین اور رہنماؤں کی طرح (جن کی تاریخ دنیا کے سامنے ہے) اپنی دعوت، ایثار و قربانی اور رابطۂ عوام کے ذریعہ خاندانی سلطنت کا قیام اور ایک موروثی حکومت کی تاسیس نہ ہو، اور وہ اپنی ان کوششوں کے ذریعہ (اس وقت جو مخلصانہ و غیر جانبدارانہ معلوم ہوتی تھیں) اپنے خاندان کے لوگوں کو بندگانِ خدا کے سر پر

---

[1] سورۃ النجم ـ ۳۰

مسلط کرنے، ان کا آقا بنانے، اور ان کے لئے مدتوں تک پیشوائی و سرداری، اور خوشحالی و فارغ البالی کی راہ ہموار کرنے اور ان کے نسل در نسل مفادات کو محفوظ کرنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو۔

ہم اس نقطۂ نظر سے جب سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معجزات کی ایک دنیا نظر آتی ہے جن میں نبوی مزاج جس کی تربیت دست قدرت نے کی تھی (أَدَّبَنِي رَبِّي فَأَحْسَنَ تَأْدِيبِي) اور اس "خلق عظیم" کی جس کی شہادت قرآن نے "وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ"[۱] کے الفاظ سے دی ہے، جلوہ افروزی نظر آتی ہے، اور نبوی سیرت کا وہ تسلسل صاف نظر آتا ہے، جس کو قرآن نے ہر نبی کی زبان سے ان الفاظ میں محفوظ کر دیا ہے۔

وَمَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝[۲]	اور اس کام کا میں تم سے کچھ صلہ نہیں مانگتا، میرا صلہ تو رب العالمین ہی کے ذمہ ہے۔

اس نکتہ کو غیر مسلم ہونے کے باوجود بازنطینی سلطنت کے سربراہ ہرقل (HERACLIUS) (۶۱۰-۶۴۱ء) نے بھی جو عیسائی تھا لیکن مذہبی لٹریچر اور مذاہب و اقوام کی تاریخ سے خصوصی واقفیت رکھتا تھا، سمجھ لیا تھا، اس نے نامۂ مبارک پانے کے بعد آپ کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے اور صحیح رائے قائم کرنے کے لئے قبیلۂ قریش کے ایک سردار ابوسفیان سے جو اتفاقاً انھیں دنوں اس کے

---

[۱] سورۃ القلم۔ ۴ [۲] سورۃ الشعراء۔ ۱۰۹ میں حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت شعیبؑ کی زبان سے نکلا ہوا علیحدہ علیحدہ یہ جملہ نقل کیا گیا ہے۔ رکوع ۶-۷-۸-۹-۱۰۔

قلمرو میں آئے ہوئے تھے، آپ کے متعلق جو سوالات کئے ان میں ایک یہ تھا، کیا اس نبی کے خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟ ابوسفیان نے نفی میں جواب دیا، بعد میں ہرقل نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا ان کے خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟ تم نے کہا نہیں، اگر کوئی بادشاہ گزرا ہوتا تو میں کہتا کہ وہ اپنے خاندان کی بادشاہت کے طالب ہیں۔[1]

اب سیرت کا اس زاویہ نگاہ اور اس پیمانہ سے جائزہ لیجئے تو قدم قدم پر ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا اس دعوت اور جدّوجہد سے مقصود ساسانی اور رومی خاندانوں سے (بنی ہاشم و بنی مطّلب تو الگ رہے، قریش بھی ایک طرف) عربوں کی طرف سلطنت منتقل کرنا نہیں تھا، چہ جائیکہ ہاشمی سلطنت یا مطّلبی سرداری کا قیام، آپ کے دین و دعوت کے ان نمائندوں کا ذہن بھی جو صحابہ کرامؓ کی صف اول میں نہیں تھے، اس بارے میں صاف تھا، اور وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس کا اظہار ربعی بن عامرؓ کے اس جواب سے ہوتا ہے، جو انھوں نے ایرانی افواج کے سپہ سالار اعظم اور رکن سلطنت "رستم" کو دیا، اس نے پوچھا "ماالّذی جاء بکم؟" تمہارے یہاں آنے کی غرض اور محرک کیا ہے؟ انھوں نے جواب میں کہا :-

اللہ ابتعثنا لنخرج من شاء من	اللہ نے ہمیں اس کام کے لئے مامور و مقرر
عبادۃ العباد إلی عبادۃ اللہ	کیا ہے کہ ہم ان لوگوں کو جن کے لئے اللہ کی
وحدہ۔[2]	مشیت ہے بندوں کی بندگی و غلامی سے

---

[1] الجامع الصحیح للبخاری۔ کتاب الوحی حصہ اول ص۷ مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی، قاہرہ۔ ۱۹۵۳ء

[2] البدایۃ والنہایۃ۔ جلد ۷ ص۳۹ مکتبۃ المعارف قاہرہ ۱۹۶۶ء

نکال کر خدائے واحد کی بندگی و غلامی

میں لے آئیں۔

آپ کا معاملہ اپنے اہل بیت اور قرابت داروں کے ساتھ (الأقرب فالأقرب) دنیاوی سرداروں، نسب پرستوں، عام حکمرانوں سے نہ صرف مختلف بلکہ متضاد تھا، آپ کا اصول یہ تھا کہ جو آپ سے جس قدر قریب ہوتا، آپ خطرات اور آزمائشوں میں اس کو اسی قدر آگے رکھتے، اور انعام واکرام اور مال غنیمت کی تقسیم کے وقت اسی قدر پیچھے، جب عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ نے (جو عرب کے نامی گرامی بہادروں اور جنگ آزماؤں میں تھے) بدر کے معرکہ میں قریش کو للکارا اور مبارز طلبی کی تو آپ نے حمزہؓ، علیؓ، عبیدہؓ کو آواز دی، ان کے مقابلہ میں بھیجا، حالانکہ آپ مکہ کے ان شہسواروں کی حیثیت سے خوب واقف تھے، مہاجرین میں متعدد ایسے جری اور شہسوار موجود تھے، جو ان سے دو دو ہاتھ کر سکتے تھے، بنی ہاشم کے یہ تینوں افراد تھے جو خون و رشتہ میں آپ سے بہت قریب تھے، اور آپ کو سب سے زیادہ عزیز و محبوب بھی، لیکن آپ نے ان کو اس خطرہ سے بچانے کے لئے دوسرے حضرات کو خطرہ میں نہیں ڈالا اور انھیں کو مقابلہ میں بھیجا، اللہ تعالےٰ کا کرنا کہ اس نے ان کو اپنے دشمنوں پر غالب کیا اور فتح نصیب فرمائی، حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، مظفر و منصور واپس آئے، حضرت عبیدہؓ کو زخمی حالت میں لایا گیا۔

خود "نہج البلاغۃ" میں حضرت علیؓ کے ایک مکتوب میں جو آپ نے حضرت معاویہؓ کو لکھا ہے، اس تاریخی حقیقت کا تذکرہ ہے، آپ فرماتے ہیں:-

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارک تھی کہ جب گھمسان کا رن پڑتا

اور لوگوں کے قدم اکھڑنے لگتے تو آپ صلعم اپنے گھر والوں (اہلِ بیت) کو آگے کر دیتے اور ان کے ذریعہ رفقاء اور خدام کو نیزوں اور تلواروں کی آنچ سے بچا لیتے اسی کا نتیجہ تھا عبیدہ بن الحارث بدر کے دن، حمزہ اُحد کے معرکہ میں اور جعفر موتہ کی جنگ میں شہید ہوئے"[۱]

لیکن آپ نے جب زکوٰۃ کی فرضیت کا اعلان کیا (جو قیامت تک باقی رہنے والا اسلامی رکن ایک دائمی و عالمگیر عالمی ادارہ (INSTITUTION) اور آمدنی کا غیر مختتم ذریعہ ہے) تو بنی ہاشم کو اس سے فائدہ اٹھانے سے قیامت تک کے لئے روک دیا اور ان کا اس میں کوئی حصہ نہیں رکھا، لیکن جب سود کو حرام قرار دیا تو اس کی ابتداء اپنے عم محترم عباس ابن عبد المطلب سے کی، جب جاہلیت کے خون و مطالبہ کو کالعدم قرار دیا تو اس کی ابتدا اپنے بھائی ربیعہ بن الحارث بن عبد المطلب کے فرزند کے خون سے فرمائی، حجۃ الوداع کے موقعہ پر آپ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا:۔

"زمانۂ جاہلیت کا سود آج سے ختم اور کالعدم ہے اور پہلا سود جو میں ختم کرتا ہوں وہ ہمارے یہاں عباس بن عبد المطلب کا سود ہے، زمانۂ جاہلیت کا خون بھی کالعدم ہے اور وہ ہمارے یہاں کا ربیعہ بن حارث بن عبد المطلب کا خون ہے، جو قبیلہ بنی لیث میں دودھ پیتے تھے، قبیلہ ہُذیل نے ان کو قتل کر دیا"[۲]

---

[۱] "نہج البلاغۃ ج ۲ ص ۲-۱۱ مطبعۃ الاستقامۃ القاہرہ۔

[۲] صحیح مسلم احیاء التراث العربی بیروت ج ۲ ص ۸۸۹ ۱۹۵۵ء کتاب الحج باب حجۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم، و ابوداؤد بروایت جابر بن عبد اللہ۔

خطرات میں آگے، منافع میں پیچھے

راحت وآرام اور انعام واکرام کے موقعہ پر آپ عام سلاطین وحکمرانوں یا سیاسی رہنماؤں کی روش اور عادت کے خلاف ان حضرات کو ہمیشہ پیچھے رکھتے تھے، اور ان پر دوسروں کو ترجیح دیتے تھے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ حضرت فاطمہؓ کو چکی پیسنے میں مشقت ہوتی تھی، اسی زمانہ میں ان کو یہ خبر ملی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کچھ باندیاں آئی ہیں، وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، اور اس کی خواستگار ہوئیں کہ ان کو بھی ان کی خدمت ومدد کے لئے کوئی باندی عطا ہو جائے آپ مکان پر نہیں ملے، وہ حضرت عائشہؓ سے کہہ گئیں حضرت عائشہؓ نے آپؐ سے اس کا تذکرہ کیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے یہاں تشریف لائے، اس وقت ہم سونے کے لئے لیٹ چکے تھے آپ کو دیکھ کر ہم کھڑے ہونے لگے، آپ نے فرمایا اپنی جگہ رہو، آپ وہیں بیٹھ گئے، یہاں تک کہ میں نے آپ کے پاؤں کی ٹھنڈک اپنے سینہ پر پائی، آپ نے فرمایا کہ میں تم کو اس سے بہتر بات نہ بتاؤں جو تم نے سوال کیا تھا جب تم سونے کے لئے لیٹو تو ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر اور ۳۳ مرتبہ الحمدللہ اور ۳۳ بار سبحان اللہ کہہ لیا کرو، یہ تمہارے لئے اس سے بہتر ہے جس کا سوال تم نے مجھ سے کیا تھا۔[1]

ایک دوسری روایت میں اسی واقعہ کے ساتھ یہ بھی آتا ہے کہ آپؐ نے حضرت علیؓ وفاطمہؓ سے فرمایا کہ خدا کی قسم اس حالت میں کہ اہلِ صُفّہ کے پیٹ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد باب الدلیل علی ان الخمس لنوائب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

بھوک سے پیٹھ سے لگ گئے ہیں، میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا، میرے پاس ان پر خرچ کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں، میں ان کو فروخت کرکے ان کی آمدنی اہلِ صُفّہ پر خرچ کروں گا۔[1]

یہاں پر سیرت نبوی کے ایسے چند واقعات اور آپ کے طرزِ عمل کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں، جن سے بآسانی اندازہ ہوسکتا ہے کہ آپ کا اپنے محبوب ترین افراد خاندان اور اہلِ بیت کے ساتھ کس طرح کا طرزِ عمل تھا، اور آپ ان کے لئے کون سا طرزِ معاشرت و معیارِ زندگی پسند فرماتے تھے، یہاں پر صرف تین واقعات نقل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ حضرت عبداللہ بن عمر راوی ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب کبھی مدینہ طیبہ سے کہیں تشریف لے جاتے تو سب کے آخر میں حضرت فاطمہؓ سے ملتے ہوئے جاتے اور جب واپس تشریف لاتے تو حضرت فاطمہؓ سے ابتداء کرتے، آپ غزوۂ تبوک سے تشریف لائے تو اس عرصہ میں حضرت فاطمہؓ نے ایک چھوٹی سی چادر خرید لی تھی جس کو زعفران میں رنگ دیا تھا، اس کو اپنے دروازے پر پردہ کے طور پر لٹکا دیا تھا یا مکان میں فرش کے طور پر بچھا دیا تھا، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی جب اس پر نظر پڑی تو واپس گئے مسجد میں آکر بیٹھ گئے، حضرت فاطمہؓ کو اس کی فکر ہوئی، انھوں نے حضرت بلالؓ کو بلا بھیجا اور ان سے کہا کہ ذرا جا کر دیکھو کہ آپ صلعم میرے گھر آکر فوراً کیوں واپس تشریف لے گئے؟ حضرت بلالؓ حاضر خدمت ہوئے اور ماجرا بیان کیا آپ نے فرمایا کہ

---

[1] روایت احمد فتح الباری جلد ۷ ص ۲۳-۲۴

میں نے وہاں نئی بات دیکھی اس لئے واپس آگیا، حضرت فاطمہؓ نے سنا تو فوراً پردہ پھاڑ دیا، اور ہر وہ چیز دور کردی جو معمول کے خلاف تھی، جو پوشاک جسم پر تھی، اتار کر اپنے پرانے کپڑے پہن لئے، حضرت بلالؓ نے آپؐ کو اس کی اطلاع دی آپؐ تشریف لائے اور فرمایا کہ جانِ پدر تمہارے لئے یہی مناسب ہے یونہی رہا کرو۔[1]

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی سے روایت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہؓ کے مکان پر تشریف لائے لیکن اندر قدم رکھے بغیر واپس تشریف لے گئے، اتنے میں حضرت علیؓ تشریف لائے، حضرت فاطمہؓ نے اس کا تذکرہ کیا، حضرت علیؓ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا اور اس کی وجہ پوچھی، فرمایا: "میں نے دروازے پر پردہ پڑا ہوا دیکھا، مجھے دنیا سے کیا سروکار؟" راوی کہتے ہیں کہ پردہ منقش تھا، جب حضرت فاطمہؓ کو یہ معلوم ہوا تو انھوں نے کہا کہ حکم فرمایا جائے فوراً تعمیل ہوگی! آپ نے فرمایا کہ فلاں خاندان والوں کو بھیج دیا جائے، ان کو آج کل (خرچ کی) ضرورت ہے۔[2]

۳۔ ثوبان مولی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے وہ کہتے ہیں جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سفر فرماتے تھے تو حضرت فاطمہؓ سے مل کر جاتے اور جب تشریف لاتے تو سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ سے ملتے آپؐ ایک غزوہ سے تشریف لائے، حضرت فاطمہ نے اس عرصہ میں اپنے دروازے پر پردہ لٹکا دیا تھا،

---

[1] کتاب ترکۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم والسبل التی وجہہا فیہا۔ تالیف امام حماد بن اسحاق ابن اسماعیل (۱۹۹-۲۶۷ھ) مطبع جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ ۱۴۰۴ھ ص۵۶، یہ واقعہ صحیح بخاری اور سنن ابوداؤد میں بھی منقول ہے۔ [2] ایضاً ص۵۵

اور حضرت حسنؓ اور حسینؓ کو چاندی کے کنگن پہنا دیئے تھے[1]، آپ تشریف لائے تو آپؐ کو انقباض ہوا آپ اندر نہیں گئے، حضرت فاطمہؓ سمجھ گئیں کہ آپؐ کو کیا چیز ناگوار ہوئی انھوں نے پردہ چاک کر دیا اور بچوں کے ہاتھ سے کنگن اتار کر ان کے ٹکڑے کر کے ان کو دے دیئے دونوں روتے ہوئے نانا کے پاس گئے (کہ آپؐ دادرسی فرمائیں گے) آپؐ نے کنگن ان کے ہاتھ سے لے لئے اور ثوبانؓ سے کہا کہ ان کو فلاں شخص (یا خاندان) کے پاس لے جاؤ، یہ میرے گھر کے لوگ ہیں، میں نہیں پسند کرتا کہ وہ اسی دنیا کی زندگی میں مزے اڑائیں، ثوبانؓ فاطمہؓ کے لئے سوت کا ایک ہار خرید دو اور ہاتھی دانت کے دو کنگن[2]۔

یہ نبوی مزاج (جو تمام انبیاء میں مشترک رہا ہے) آپ کے اس جملہ سے ظاہر ہوتا ہے جس میں فرمایا گیا "انا معشر الأنبیاء لا نورث، ما ترکنا صدقۃ"[3] (ہم گروہِ انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا، ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ اور عام مسلمانوں کا حصہ ہے.)

اتنا ہی نہیں آپؐ نے قیامت تک کے لئے اپنے تعلق والوں (آل محمد صلعم) کے لئے ایثار و قربانی اور زہد و قناعت کی زندگی پسند فرمائی، اور اس کو ان کے لئے

---

[1] حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ مشکل سے اس زمانہ میں تین چار سال کے رہے ہوں گے۔

[2] ص۵۵۔۵۸ یہ روایت ابوداؤد اور مسند احمد وغیرہ میں بھی آئی ہے۔

[3] صحیح بخاری و سنن أبی داؤد

خدا سے مانگ گئے، آپ کی دعا تھی "اللھم اجعل رزق آل محمد قوتا"[1] (اے اللہ آل محمد کا رزق بقدر ضرورت ہو۔)

اسلام میں ذاتی سعی و صلاحیت پر نجات و ترقی کا انحصار

ایسی حالت میں اس کا کیا امکان تھا کہ آپ نے اپنے خاندان والوں کے لئے موروثی ریاست و حکومت کا انتظام فرما دیا ہو، اور خلافت و امامت[2] کو ان میں محدود و محفوظ فرما گئے ہوں[3]، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس دین کی عمومیت، انسانی مساوات کے اسلامی اصول اور "إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ" کے واضح اعلان کے باقی رکھنے اور امت محمدیہ کے تمام افراد کو ہر زمانہ میں اپنے عمل اپنی کوشش اور اپنے علم و اخلاص صلاحیتوں کے بقدر اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب روحانی اور مناصب دنیاوی تک پہونچنے کے امکانات کو روشن کرنے اور امت میں جذبۂ عمل و مسابقت پیدا کرنے کے لئے یہی مناسب تھا کہ آپ اہل بیت اور اپنی ذریت کے لئے علم و عمل اور سعی و جہد کا

---

[1] صحیح بخاری (کتاب الرقاق) صحیح مسلم (کتاب الزہد)۔ [2] فرقہ اثنا عشریہ کے یہاں امامت کا جو وسیع مفہوم اور اس کے جو حدود و اختیارات ہیں، ان کا ذکر آگے آئے گا۔

[3] فرقہ اثنا عشریہ کے نزدیک حضرت علیؓ وصی اور نصِّ رسول اور قرآنی آیات کے مطابق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین اول، خلیفۂ بلا فصل، اور امام معصوم تھے، کہ امام کے بغیر دنیا قائم نہیں رہ سکتی اور ان سب کا اہل بیت سے ہونا ضروری ہے، اللہ کی حجت اپنی مخلوق پر اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک کہ امام نہ ہو اور اس کا علم نہ ہو جائے، ان اماموں کا پہچاننا اور ماننا شرط ایمان ہے۔ (ملاحظہ ہو رجال کشی ص۴، اصول کافی ص۱۰۴)

میدان کھلا رکھیں، اور امت کے کان میں ہر زمانہ میں قرآن کی لگائی ہوئی یہ صدا آتی ہے:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ — اور اپنے پروردگار کی بخشش اور بہشت
وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ — کی طرف لپکو جس کا عرض آسمان اور
وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ — زمین کے برابر ہے، اور جو (خدا سے)
(سورۃ آل عمران ۔ ۱۳۳) — ڈرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

قرآن نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ انسان کی کامیابی، ترقی اور فلاح کا انحصار اس کی ذاتی سعی پر ہے:۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى — اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی
وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى — وہ کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اس کی
ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى — کوشش دیکھی جائے گی، پھر اس کو
(سورۃ النجم ۔ ۳۹۔۴۱) — اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

اور یہ کہ کوئی انسان قیامت میں کسی دوسرے انسان کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، ہر شخص اپنے عمل کا ذمہ دار اور جواب دہ ہے:۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى — اور کوئی شخص کسی (کے گناہ) کا بوجھ
(سورۃ الانعام ۔ ۱۶۴) — نہیں اٹھائے گا۔

صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ آپؐ نے اپنے قبیلۂ خاص بنی عبد مناف اور اس میں سے بھی قریب ترین اور عزیز ترین خاندانی افراد میں سے ایک ایک کا نام لے لے کر فرمایا کہ میں اللہ کے معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا، یہاں جو کچھ لینا ہو مجھ سے لے لو۔[1]

---

[1] یعنی وہاں اپنا ذاتی عمل و سعی ہی کام آئے گا۔

یا بنی عبد مناف لا اغنی عنکم	اے بنی عبد مناف! میں اللہ کے معاملے
من اللہ شیئاً ویا صفیۃ	میں تمہاری مدد نہیں کر سکوں گا اور
عمۃ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ	اے صفیہ رسول اللہ کی پھوپھی! میں اللہ
وسلم) لا أغنی عنک من اللہ	کے معاملے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا
شیئاً، ویا فاطمۃ بنت محمد	اور اے فاطمہ بنت محمد! مجھ سے میرے
(صلی اللہ علیہ وسلم) سلینی	مال میں سے جو چاہے مجھ سے مانگ لو مگر اللہ
ما شئت من مالی لا أغنی عنک من اللہ شیئاً[1]	کے معاملے میں میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔

بلکہ آپ نے یہ کہہ کر اس پر مہر ثبوت ثبت کر دی کہ "من ابطأ بہ عملہ لم یسرع بہ نسبہ" (جو اپنے عمل کے لحاظ سے پیچھے رہ گیا اس کو اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکتا)

خلفاء کی ترتیب اور اہل بیت کے ساتھ خدا کا معاملہ عظیم حکمتوں پر مبنی تھا

ہمارے نزدیک نہ یہ اتفاقی واقعہ تھا نہ کسی سازش اور منصوبہ بندی کا نتیجہ کہ آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد مسند خلافت پر آپ کے خاندان کے کسی فرد کے بجائے (جو بلاشبہ اعلیٰ انسانی اوصاف و کمالات کا حامل تھا) قریش کی ایک دوسری شاخ (بنو تیم) کا ایک فرد (ابو بکر صدیقؓ) مسلمانوں کے عام انتخاب و پسندیدگی کے مطابق متمکن ہوا، جو بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب میں سے نہ تھا، تاکہ پہلے ہی مرحلہ میں یہ بات ذہنوں میں راسخ اور عالم آشکارا ہو جائے کہ اسلام کوئی وراثتی نظام اور خاندانی مسئلہ نہیں ہے، اس میں خلافت و امامت کا انحصار قابلیت، خدمات اور

[1] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب التفسیر، باب وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ۔

مسلمانوں کی عام پسندیدگی اور فیصلہ پر ہے۔

پھر راقم سطور کے نزدیک یہ بھی محض کسی اتفاق یا مجبوری کی بات نہیں تھی کہ اس کے بعد بھی صدیوں تک بنی ہاشم کے ساتھ خدا اور امت کا یہی معاملہ رہا کہ وہ محض اپنے علم و فضل، زہد و تقویٰ، ایثار و قربانی، حمیّت اور اولوالعزمی کے ذریعہ امت محمدیہ کے اعزاز و اکرام کے مستحق اور علمی و دینی امامت و قیادت پر فائز ہوتے رہے، اور امت ان کی خدمت میں اپنی عقیدت و محبت کا خراج پیش کرتی رہی، انھوں نے متعدد بار نازک ترین موقعوں پر امت کی مدد کی، دشمنانِ اسلام کے خلاف صف آرا ہوئے، اور اپنی سچی روحانیت اور بلند عزیمت کے ذریعہ مسلم معاشرہ میں نئی روح اور نئی توانائی پیدا کر دی[1]، ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ۔

قرآن کی صحت و محفوظیت پر نصوص قرآنی

۳۔ نمبر ۲ میں ہم نے یہ کہا تھا کہ نبوت دائمی کے لئے تیسری شرط یہ ہے کہ اس آخری پیغمبر پر جو آخری آسمانی صحیفہ نازل ہوا اور جو اس کے دین کی اساس اور اس کی دعوت و تعلیمات کا سرچشمہ اور مخلوق کو خالق سے مربوط کرنے کا دائمی ذریعہ ہے، وہ اپنے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ شہید کربلا کے بعد سے ان مردان کار، روحانی پیشواؤں اور مجددین اسلام کے سیر و سوانح جن کا تعلق خاندان سادات اور اہل بیت سے تھا جنھوں نے بڑے نازک موقعہ پر امت کی مدد کی، بیشتر اسلامی ممالک کی تاریخ ان کے کارناموں سے آراستہ و مزیّن ہے، اور مسلمان اس کے معترف اور اس پر فخر کرتے ہیں۔

ایک ایک حرف و نقطہ کے ساتھ محفوظ، قابل فہم اور انسانی دسترس میں ہو، جس کی قراءت و تلاوت، حفظ و استحضار اور تفہیم و تعمیم کا سلسلہ ہر زمانہ میں جاری ہو، اور اس میں صحف سابقہ کی طرح نہ تحریف عمل میں آئی ہو اور نہ وہ کسی طبقہ، خاندان یا نوادر و مخطوطات کے کتب خانہ میں آثار قدیمہ یا خاندانی دستاویزات و سندات اور وصیت ناموں کی طرح محفوظ ہو، اور خاص خاص لوگوں کو دکھایا جاتا ہو، اور وہی اس سے واقف ہوں۔

اس سلسلہ میں قرآن مجید کی تصریحات بہت واضح اور قطعی ہیں، نزول قرآن کے وقت جب جبریل امینؑ اس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہونچا رہے تھے، اور آپ اس کو قلب مبارک میں فوراً محفوظ کرنے اور پھر اس کو بنفسہٖ دوسروں تک پہونچانے کے لئے فکرمند تھے، یہ وعدہ فرمایا گیا کہ:۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۚ	اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے
فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۚ	ذمہ ہے، جب ہم وحی پڑھا کریں تو تم
ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ؕ	(اس کو سنا کرو اور) پھر اسی طرح
(سورۃ القیٰمۃ۔ ۱۷۔۱۸۔۱۹)	پڑھا کرو، پھر اس (کے) معانی کا بیان
	بھی ہمارے ذمہ ہے۔

اس میں سینۂ مبارک میں محفوظ ہونے پھر بے کم و کاست اس کی تلاوت کر سکنے، پھر اس کی توضیح و تشریح کا انتظام ہونے اور اس کا سلسلہ قیامت تک جاری ہونے کی ذمہ داری لی گئی ہے، پھر جب قرآن شریف لوگوں تک پہونچ گیا پھر کسی نے اس کو کُلاً کسی نے جزءً احفظ کیا، اس کو اپنے سینہ میں محفوظ کر لیا، پھر غزوات

اور جنگیں پیش آئیں مسلمان دنیا کے ممالک میں منتشر ہوئے اور زمانہ میں انقلابات پیش آئے تو اس کا ذمہ لیا گیا کہ یہ قرآن مجید اپنے الفاظ کے ساتھ قیامت تک محفوظ رہے گا، فرمایا گیا:۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ (سورۃ الحجر۔ ۹)

بیشک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

غیر مسلم مورخین و فضلاء کی شہادتیں

قرآن مجید کی محفوظیت کے اس عقیدہ پر (سوائے فرقہ اثنا عشریہ کے) تمام قدیم و جدید مسلمانوں کا اتفاق ہے، ہمیں یہاں ائمۂ اسلام، مشاہیر علماء اور مسلم فضلاء کے اقوال نقل کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ اہل سنت کے نزدیک جزء ایمان اور ان کا متفق علیہ عقیدہ ہے[1]، ہم یہاں غیر مسلم فضلاء اور خاص طور پر عیسائی مصنفین اور مورخین کی شہادتیں پیش کرتے ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں یہ اعتراف موجود ہے کہ:۔

"قرآن روئے زمین پر سب کتابوں سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے"[2]

مستشرقین اور یورپی محققین جو قرآن کے بارے میں یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ وہ محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بذریعہ وحی نازل ہوا، وہ بھی مذکورہ بالا خیال سے

---

[1] قرآن مجید کی حفاظت و کتابت و نشر و اشاعت کے بارے میں تفصیلات متند عربی کتابوں میں دیکھی جائیں جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں، اردو خواں حضرات پروفیسر سید نواب علی صاحب کی محققانہ کتاب "تاریخ صحف سماوی" کا مطالعہ کریں۔ [2] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا عنوان "قرآن"

متفق ہیں، سر ولیم میور (SIR WILLIAM MUIR) جو پیغمبر اسلام کے متعلق اپنے تعصّب کے لئے مشہور تھے، جس کے سبب ہندوستانی مسلمانوں کی نئی تعلیم کے علمبردار سر سید احمد خاں کو ان کی کتاب "LIFE OF MOHAMMAD" کے جواب میں خطبات احمدیہ لکھنی پڑی تھی، وہ مذکورہ کتاب میں لکھتے ہیں :۔

"حضرت محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے ربع صدی کے بعد اندر ہی ایسے شدید مناقشات اور فرقہ بندیاں پیدا ہوئیں جن کے نتیجے میں حضرت عثمان رضؓ شہید کر دیئے گئے، اور یہ اختلاف آج بھی باقی ہے، لیکن ان سب فرقوں میں قرآن ایک ہی ہے، ہر زمانہ میں تواتر کے ساتھ ان سبھی فرقوں کا ایک ہی قرآن پڑھنا اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ آج ہمارے سامنے وہی صحیفہ ہے، جو اس بد قسمت خلیفہ کے حکم سے[1] تیار کیا گیا تھا شاید پوری دنیا میں کوئی دوسری ایسی کتاب نہیں جس کی عبارت بارہ[12] صدیوں تک اس طرح بغیر تبدیلی کے باقی رہی ہو، قرآن میں قراءت کا اختلاف حیرت انگیز طور پر بہت کم تعداد میں ہے، یہ بھی ان اعراب کی وجہ سے ہے جو بہت بعد کے زمانہ میں لگائے گئے تھے"[2]

وھری (WHERRY) اپنی تفسیر قرآن میں لکھتا ہے :۔

"تمام قدیم صحیفوں میں قرآن سب سے زیادہ غیر مخلوط اور خالص (PUREST) ہے"[3]

---

[1] معذرت کے ساتھ مصنف کا اشارہ ان کی شہادت کی طرف ہے جو اسلامی نقطۂ نظر سے ایک سعادت و نعمت ہے

[2] SIR WILLIAM MUIR. "LIFE OF MOHAMMAD" (1912) P. XXII/XXIII

[3] COMMENTARY OF THE QURAN VOL. I 349

لین پول کہتا ہے (LANE POOLE) :-

"قرآن کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی اصلیت میں کوئی شبہ نہیں ہے ہر حرف جو ہم آج پڑھتے ہیں، اس پر یہ اعتماد کر سکتے ہیں کہ تقریباً تیرہ[۱۳] صدیوں سے غیر مُبدّل رہا ہے"[۱]

باسورتھ اسمتھ لکھتا ہے :-

"ہم ایک کتاب (قرآن) رکھتے ہیں جو اپنی اصلیت میں اپنے محفوظ رہنے میں اپنے مضامین کی بے ترتیبی میں بالکل یکتا ہے، لیکن اس کی جوہری صداقت میں کوئی شخص کبھی سنجیدہ شک نہ کر سکا"[۲]

پروفیسر آرنلڈ اپنی کتاب (ISLAMIC FAITH) میں لکھتا ہے :-

"قرآن مجید کا متن محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں"[۳][۴]

پروفیسر فلپ ہٹی (PHILIP HITTI) کہتا ہے کہ :-

"قرآن مجید میں بلا شک وشبہ محمد صلعم کے الفاظ ہیں[۴] جن میں نہ کوئی اضافہ ہوا نہ کمی ہوئی"[۵]

اس سے بھی زیادہ شہادتیں اور اعترافات پیش کئے جا سکتے ہیں، لیکن ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

---

[۱] SELECTION FROM THE QURAN P. C.

[۲] BOSWORTH OP. CIL, P. 22

[۳] ISLAMIC FAITH, P. 9

[۴] یہ بات ذہن میں رہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں کلام الٰہی کا جو تخیل مسلمانوں کے یہاں ہے، یعنی معنی اور الفاظ دونوں اللہ کی طرف سے ہوں، وہ نہیں پایا جاتا، وہ بے تکلف اپنے صحف مقدسہ کے سلسلہ میں "مصنفین" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

[۵] P. K. HITTI, "HISTORY OF THE ARABS" P. 123

قرآن مجید کے بارے میں فرقہ اثنا عشریہ کے عقائد و بیانات

اب اس کے بالمقابل فرقہ اثنا عشریہ کے قرآن کے بارے میں اقوال کا جائزہ لیجئے، وہ قرآن مجید میں تحریف کے قائل ہیں، اور اس پر تقریباً ان کا اتفاق ہے[1]، علامہ نوری طبرسی نے قرآن کے محرّف ہونے کے ثبوت میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی جس کا نام "فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الأرباب"[2] انھوں نے لکھا ہے کہ ہمارے ائمہ معصومین کی دو ہزار سے زیادہ روایتیں ہیں، جو یہ بتلاتی ہیں کہ موجودہ قرآن میں تحریف ہوئی، اور ہر طرح کی تحریف ہوئی[3]، فرقہ اثنا عشریہ کے خاتم المحدثین اور مذہب شیعہ کے ترجمان اعظم علامہ باقر مجلسی کے زمانہ یعنی دسویں وگیارہویں صدی ہجری بلکہ اس کے بعد تک بھی شیعہ علماء و مصنفین پورے ادّعا کے ساتھ یہی کہتے اور لکھتے رہے کہ موجودہ قرآن میں تحریف، تغیّر، تبدّل اور کمی بیشی ہوئی ہے[4]، ناظرین کی نظر سے امام خمینی کی یہ عبارت گذر چکی ہے کہ :-

آں آیات را از قرآن بردارند	(صحابہ کے لئے آسان تھا کہ) ان آیات
وکتاب آسمانی را تحریف کنند و برائے	کو قرآن مجید سے نکال دیں اور کتاب
ہمیشہ قرآن را از نظر جہانیاں	آسمانی میں تحریف کریں اور ہمیشہ کے لئے

---

[1] اس اتفاق واجماع سے صرف چار[1] اشخاص (صدوق[1]، شریف[2] مرتضیٰ، ابوجعفر طوسی[3]، ابوعلی طبرسی[4]) کا استثناء کیا گیا ہے لیکن ان میں سے بعض کا رجوع ثابت ہے اور بعض کے متعلق (اہلِ تشیع کے اصول تقیہ کی روشنی میں) اس شبہ کی گنجائش ہے کہ انھوں نے یہ بات ازراہ تقیہ کہی ہو [2] یہ کتاب پاکستان میں چھپ گئی ہے [3] فصل الخطاب ص۲۲۷ [4] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب "ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت" از مولانا محمد منظور نعمانی ص۱۵۶

بیندازندہ[1] | قرآن کو دنیا والوں کی نگاہ سے مستور بنا دیں۔

اس کے آگے لکھتے ہیں:۔

ہمہ عیبے را کہ مسلماناں بکتاب	تحریف کا وہ عیب جو مسلمان یہود
یہود و نصاریٰ می گرفتند عیناً	و نصاریٰ پر لگاتے ہیں ان صحابہ پر
برائے خود اینہا ثابت شود[2]	ثابت ہے۔

"اصول کافی" میں جو حضرات شیعہ کے یہاں معتبر ترین کتاب ہے، ان آیات کی مثالیں دی گئی ہیں، جن میں سے پوری پوری آیتیں نکال دی گئی ہیں، اور تحریف کی گئی ہے[3]، بلکہ یہاں تک دعویٰ کیا گیا ہے کہ قرآن کا تقریباً دو تہائی حصہ غائب کر دیا گیا ہے، اس کی تعداد ستر ہزار آیتیں تھیں[4]، ان کا اعتقاد ہے کہ اصل قرآن وہ ہے، جو حضرت علیؓ نے مرتّب فرمایا تھا، وہ امام غائب کے پاس ہے اور موجودہ قرآن سے مختلف ہے[5]، بعض ائمہ نے فرمایا کہ ہمارے پاس مصحف فاطمہؓ ہے جو موجودہ قرآن سے سہ گنا ہے[6]۔

قرآن مجید کے ساتھ بے اعتنائی

ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ حضرات شیعہ کو اس قرآن مجید سے جو امّتِ محمدیہ عالم اسلام میں مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے

لہ کشف الاسرار ص۱۱۴ ۲ہ ایضاً ۳ہ ملاحظہ ہو "اصول کافی" ص۲۶۲-۲۶۴-۲۶۶-۲۶۷
۴ہ "اصول کافی" ص۲۷۱ ۵ہ ایضاً ۶ہ ایضاً ص۱۶۰

لے کر جنوب تک تلاوت کرتی ہے اور جس کے حفّاظ کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے، اور جن سے کوئی گوردہ اور بدقسمت مقام ہی خالی ہوگا، رمضان المبارک میں چھوٹی سی چھوٹی مسجد میں تراویح میں ایک ایک دو دو بار ختم ہوتے ہیں، عملاً کوئی وابستگی اور دلچسپی نہیں، یہ مشہور بات ہے کہ شیعوں میں حفّاظ نہیں ہوتے اور قرآن مجید کی اصلیت میں شک ہونے پر نفسیاتی طور پر ایسے ہی ہونا چاہیے، راقم سطور کو اپنے سفر ایران (۱۹۷۳ء) میں خود اس کا تجربہ ہوا، دنیائے اسلام میں کسی دور دراز مقام پر بھی کوئی چھوٹا موٹا جلسہ ہو، کوئی ایسا قاری مل جاتا ہے جو اپنے حفظ سے قرآن مجید کا کوئی رکوع یا سورہ سنائے، راقم سطور کو جو ایک مؤقر وفد کی قیادت کر رہا تھا، اور اس کے رفقاء کو ایک نامور ممتاز شیعہ عالم و مجتہد (جو آیت اللہ العظمیٰ کے لقب سے ملقب تھے) کے دولت خانہ پر جو زریں نعل تہران میں واقع ہے، استقبالیہ دیا گیا، جلسہ کا آغاز ان کے صاحبزادہ نے قرآن مجید ہاتھ میں لے کر اور اس سے کچھ آیتیں پڑھ کر کیا، قم اور مشہد کی مساجد و مشاہد میں قرآن مجید کی تلاوت کی آواز آتی تھی، وہ عام طور پر مصری قاریوں کے کیسٹ ہوتے تھے، اسی بناء پر اثنا عشری کتب خانہ میں قرآن مجید کی خدمت کے وہ آثار اور نمونے نہیں ہیں، جن سے عام اسلامی ملکوں کے کتب خانے مالا مال ہیں۔

منکرین کے لئے حجّت

ایسی صورت میں مسلمان اس عقیدہ کے ساتھ دنیا کو اپنے دین کی دعوت اور قرآن مجید کو اپنی صداقت اور اپنی دعوت و تعلیمات کی صحت و فضیلت کی سند

کے طور پر کیسے پیش کر سکتے ہیں؟ اور اسلام اور مسلمانوں کی یہ تصویر جو اس عقیدہ کے ساتھ ابھرتی ہے اس میں کتنی دلکشی اور زیبائی اور ان لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے یا اس کے مطالعہ پر آمادہ کرنے کی (جو اس کے دائرہ سے باہر ہیں) کتنی صلاحیت پائی جاتی ہے؟ کیا دنیا کو (تحریف قرآن کے اس دعوے کے بعد) مسلمان داعی سے یہ کہنے کا حق نہیں کہ ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

ائمہؑ کی تعریف اور ان کے اوصاف "وحدت نبی" اور "ختم نبوت" کے منافی

۴۔ چوتھی اور آخری چیز جس کو ہم نے نبوت دائمی اور "امت خالدہ" کے لئے شرط قرار دیا تھا، وہ یہ تھی کہ نبی ہی کی ذات مرکزِ ہدایت اور امت کی قلبی وابستگی اور ذہنی سپردگی کا محور ہو، اور عقیدۂ وحدانیتِ الٰہی کے ساتھ (جہاں تک نبی کی ذات و شریعت کا تعلق ہے) وہ وحدت مطاع و شارع کی بھی حامل ہو، اس موقعہ پر علامہ اقبال کے یہ الفاظ بڑے معنی خیز و فکر انگیز ہیں جو انھوں نے قادیانیت پر تنقید کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھے :۔

"ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین کے خدا کی طرف سے ظاہر ہوا، لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملّت کے رسول کریم کی شخصیت کا مرہون منّت ہے...... مسلمان ان تحریکوں کے مقابلہ میں زیادہ حسّاس ہیں جو اس کی وحدت کے لئے خطرناک ہیں، اس لئے کہ اسلامی وحدت

ختم نبوت سے ہی اُستوار ہوتی ہے"[۱]

اب امامت کے بارے میں فرقۂ اثنا عشریہ کے عقائد و اصول پر ایک نظر ڈال لیجئے، جو ہم "اصول کافی" سے اخذ و اقتباس کر کے نقل کرتے ہیں[۲] اثنا عشری حضرات کے نزدیک نبی کے جانشین، خلیفہ، امام بھی اللہ تعالےٰ کی طرف سے مقرر اور نامزد ہوئے، وہ نبی ہی کی طرح معصوم، مُفترَض الطاعۃ ہوتے ہیں ان کا درجہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برابر اور سب نبیوں سے بالاتر ہوتا ہے اللہ تعالےٰ کی حُجّت اپنی مخلوق پر بغیر امام کے قائم نہیں ہو سکتی، یہ بات اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اس کا علم نہ ہو جائے، امام کے بغیر دنیا قائم نہیں رہ سکتی، اماموں کا جاننا پہچاننا شرطِ ایمان ہے، ائمہ کی اطاعت رسولوں ہی کی طرح فرض ہے، ائمہ کو اختیار ہے جس چیز کو چاہیں حلال اور جس چیز کو چاہیں حرام قرار دے دیں، ائمہ انبیاء ہی کی طرح معصوم ہوتے ہیں، ائمہ معصومین کو ماننے والا اگر ظالم، فاسق فاجر بھی ہے تو جنتی ہے ——— ائمہ کا درجہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برابر اور ساری مخلوق اور دوسرے تمام انبیاء علیہم السلام سے برتر و بالاتر ہے، ائمہ کو ماکان ومایکون کا علم حاصل تھا، ائمہ کے سامنے بندوں کے دن رات کے اعمال پیش ہوتے ہیں، ائمہ کے یہاں دن رات فرشتوں کی آمد و رفت جاری ہے، اور ہر شب جمعرات میں ان کو معراج ہوتی ہے، ائمہ پر ہر سال شبِ قدر میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے ایک کتاب نازل ہوتی ہے، موت ان کے اختیار میں ہوتی ہے، اور وہ دنیا و آخرت کے

---

[۱] حرف اقبال، ص ۱۲۲-۱۳۶ [۲] ملاحظہ ہو "اصول کافی" ص ۱۰۳-۲۵۹۔ "وشرح اصول کافی" دوم ص ۲۲۹ ہر جز کا حوالہ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی کتاب "ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" میں دیکھا جا سکتا ہے۔

مالک ہیں جس کو چاہیں دے دیں اور بخش دیں۔

امامت کے اس تصور سے غیر مسلم علماء نے بھی یہی مطلب اخذ کیا ہے، چنانچہ پیٹرک ہوجیس (PATRICK HUGES) نے لکھا ہے کہ شیعہ انھیں "خدائی صفات سے متصف کرتے ہیں"[۱] ایک دوسرے محقق آئیونوف (W. IVONOW) نے لکھا ہے کہ امامت کی روشنی کا ہمیشہ دنیا میں جاری و ساری رہنا نبوت کو ذیلی مقام عطا کرتا ہے[۲]، امامت کے بارے میں فلپ۔کے۔ہٹی رقم طراز ہے کہ "بانی اسلام نے وحی یعنی قرآن کو انسان اور خدا کے درمیان واسطہ قرار دیا تھا، لیکن شیعوں نے اس واسطہ کو ایک انسان یعنی امام کی شکل دے دی" میں اللہ پر ایمان لایا، اور میں قرآن پر ایمان لایا جو غیر مخلوق ہے" کے ساتھ شیعوں نے یہ اضافہ کردیا کہ "میں امام پر ایمان لایا جسے خدا نے انتخاب کیا ہے، اور جو خدائی صفات میں شریک ہے اور نجات دہندہ ہے"[۳]۔

۱ھ THOMAS PATRICK HUGES, DICTIONARY OF ISLAM. LONDON 1885 P. 574

۲ھ H. A. R. GIBBS AND J. H. KRAMER SHORT OR ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM, LEIDEN 1953, P. 248

۳ھ PHILLIP K. HITTI, HISTORY OF THE ARABS, LONDON. 1973 P. 248

مالک ہیں جس کو چاہیں دے دیں اور بخش دیں۔

قدیم ایران کے عقائد کا پرتو

اس غالی عقیدۂ امامت میں جس کے حدود نسل ونسب پرستی سے آگے بڑھ کر تقدیس وتالیہ تک پہونچ جاتے ہیں، قدیم ایران کے عقائد کا پرتو پایا جاتا ہے، ایران میں (ماقبل اسلام) دینی سیادت وقیادت کسی خاص قبیلہ میں مرکوز ہوتی تھی، قدیم زمانہ میں دینی پیشوائی اور حکمرانی قبیلۂ میڈیا میں مرکوز تھی، زردشت کے ایران پر اثر اور زردشتی مذہب کے غلبہ کے بعد یہ پیشوائی قبیلۂ المغان کی طرف منتقل ہو گئی، پُروہتوں کے طبقہ (PRIEST CLASS) کے بارے میں اہلِ ایران کا عقیدہ تھا کہ وہ زمین اور اہلِ زمین پر سایۂ خداوندی (ظل اللہ) ہیں، وہ معبودوں کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، حکمراں کا اس قبیلہ سے ہونا ضروری ہے، اس میں ذات الٰہی مجسّم ہو جاتی ہے، آتش کدہ (بیتُ النّار) کے انتظام اور مُجاوری کا منصب تنہا اسی قبیلہ کا حق ہے۔[1]

عصرِ حاضر کے مشہور مصری فاضل ومحقق ڈاکٹر احمد امین نے اپنی مشہور کتاب "ضُحیٰ الاسلام" جلد ثالث میں شیعوں کے اپنے ائمہ کے بارے میں عقیدہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"ایرانیوں میں سے ایک بڑی تعداد نے تشیّع اس لئے قبول کیا کہ ایرانی شہنشاہی کے زمانے میں حکمراں خاندان کی تعظیم وتقدیس ان کی گھُٹّی میں

---

[1] ملاحظہ ہو مذہب زردشتی کی تاریخ کی کتابیں، نیز ایران قدیم کی کتب تاریخ ومذہب۔

پڑی ہوئی تھی، ان کا عقیدہ تھا کہ حکمرانوں کی رگوں میں جو خون دوڑتا ہے وہ رعیت وجمہور کے خون کی جنس سے نہیں ہے، جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اس نظر سے دیکھا جیسے وہ اپنے شہنشاہ کسریٰ کو دیکھتے تھے، اور آپ کے خاندان کے لوگوں کو اس نظر سے جس سے حکمراں خاندان کو دیکھنے کے عادی تھے۔

جب پیغمبرؐ نے اس دنیا سے رحلت کی تو ان کے نزدیک قدرۃً آپؐ کی جانشینی کے حقدار آپؐ کے خاندان ہی کے لوگ ہو سکتے تھے۔"[1]

امام غائب کا عقیدہ

امامت اور ائمہ کے بارے میں ان غالیانہ خیالات وعقائد کا جو ان کو شارکت فی النبوت، پھر شارکت فی الالوہیت کی حد تک پہونچا دیتے ہیں، اور ان کو مافوق البشر ہستی قرار دیتے ہیں، نقطۂ ارتقا (CLIMAX) فرقہ اثنا عشریہ کے امام غائب کا عقیدہ ہے جو بارہویں امام ہیں، ان کی پیدائش وغیبت، اِس وقت تک ان کی حیات اور ہدایت ورہنمائی کا عقیدہ عقل وقیاس اور خدا کے قانون تکوینی وتشریعی سے بے نیاز ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ گیارہویں امام حسن عسکری کی وفات سے دسؐ دن پہلے ان کے صاحبزادہ پورے سامان امامت اور خاندان کے ورثہ کے ساتھ شہر "سُرَّ مَن رَأی" کے غار میں روپوش ہو گئے، وہ ابھی تک وہاں زندہ سلامت موجود ہیں، اور قیامت تک زندہ اور روپوش رہیں گے، اور جب وہ وقت آئے گا جو ان کے

---

[1] ضحی الاسلام ج ۳/ ص ۲۰۹

ظہور کے لئے مناسب ہے تو اس وقت غار سے برآمد ہوں گے اور ساری دنیا میں انھیں کی حکومت ہوگی۔[1]

بات یہیں پر جاکر ختم نہیں ہوتی، امام غائب کی ایک غیبتِ صغریٰ تھی جس میں ان کے پاس رازدارانہ طور پر ان کے سفراء اور حاملین پیغام کی آمد و رفت رہتی تھی، اس کے بعد یہ سلسلہ بند ہوگیا اور مشہور کر دیا گیا کہ اب غیبت صغریٰ کا دور ختم ہو کر غیبت کبریٰ کا دور شروع ہوگیا، اب صاحبُ الزّمان کے ظہور تک کسی کی ان تک رسائی نہ ہو سکے گی۔[2]

ائمہ کے بارے میں علامہ خمینی کا مسلک و عقیدہ

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ یہ علم تحقیق، فکر و مطالعہ اور عالم اسلام اور جماعت مسلمین سے ربط و تعلق اور ایک عام دعوت انقلاب سے پیشتر کی باتیں ہیں جب فرقہ اثنا عشریہ کی بنیاد غلو اور انتہا پسندی پر تھی اور وہ اپنے دائرہ کے اندر محدود تھا، اب اس وقت کا کوئی پڑھا لکھا شیعہ، روح و مقاصدِ اسلام سے واقف، اور ملّت کا درد رکھنے والا داعی ایسی ناقابلِ یقین باتیں نہیں کہہ سکتا تو ہم یہاں پر امام خمینی کی اپنی کتاب "الحکومۃ الاسلامیۃ" کی ایک عبارت پیش کرتے ہیں، ص۵۲ الولایۃ التکوینیۃ کے عنوان کے تحت حسب ذیل عبارت آئی ہے، جو ہم بلفظہ نقل کرتے ہیں:۔

فان للإمام مقاما محمودًا ودرجۃ	امام کو مقام محمود، درجۂ عالی اور ایسی
سامیۃ وخلافۃ تکوینیۃ تخضع	خلافت تکوینی حاصل ہوتی ہے جس کی

---

[1] ملاحظہ ہو "اصول کافی" ص۲۰۲-۲۰۷   [2] ملاحظہ ہو "احتجاج طبرسی" ص۲۳۰

بولايتها وسيطرتها جميع ذرات	عظمت اور غلبہ کے سامنے کائنات کے
هذا الكون، وان من ضروريات	تمام ذرّے سرنگوں ہوتے ہیں ہمارے دین
مذهبنا ان لأئمتنا مقاماً لا يبلغه	کے قطعی الثبوت مسائل میں سے یہ ہے کہ
ملك مقرب ولا نبي مرسل،	ہمارے اماموں کو وہ مقام حاصل ہے
وبموجب مالدينا من الروايات	جس کو نہ کوئی مقرب فرشتہ پہونچ سکتا
والأحاديث فإن الرسول	ہے، نہ نبی جس کی بعثت ہوئی اور ہماری
الأعظم (ص) والأئمة (ع)	روایات واحادیث کے بموجب رسول اکرم
كانوا قبل هذا العالم انواراً	صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام
فجعلهم الله بعرشه محدقين	اس عالم سے پہلے انوار (روشنیاں)
وجعل لهم من المنزلة	تھے، اللہ نے ان کو اپنے عرش کا احاطہ
والزلفى مالا يعلمه الا الله[1]	کرنے والا بنا دیا، اور ان کو ایسا مرتبہ
	وقرب عطا فرمایا جس کا علم صرف اللہ کو ہے۔

علامہ خمینی امام غائب اور ان کے ظہور کے اسی طرح قائل ہیں جیسے فرقہ اثنا عشریہ کے دوسرے علماء و مصنفین، ان کے نزدیک امام غائب کی غیبوبت پر اگرچہ ایک ہزار سال سے زائد مدت گزر چکی ہے لیکن ممکن ہے کہ ابھی اسی طرح ہزاروں سال اور گزر جائیں۔[2]

---

[1] الحكومة الإسلامية ص۵۲ یہ کتاب براہ راست ایران سے آئی، وہ کتاب خانہ بزرگ اسلامی کی مطبوعہ ہے اور وہ ہمارے پاس موجود ہے۔ [2] ایضاً ص۷۶-۷۷

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ایک اہم مکاشفہ

امامت کے بارے میں ان مُشرکانہ عقائد کو سامنے رکھ کر حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا یہ مکاشفہ و مکالمہ بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے جو ان کو عالم مراقبہ میں حاصل ہوا، وہ فرماتے ہیں کہ "میں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روحانی طور پر فرقۂ شیعہ کے متعلق دریافت کیا مجھے جواب ملا کہ ان کا مذہب باطل ہے اور ان کے مذہب کا بُطلان لفظ "امام" سے سمجھا جا سکتا ہے" شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جب اس روحانی مراقبہ کی کیفیت ختم ہوئی تو مجھے خیال آیا کہ واقعی "امام" ان حضرات کے نزدیک وہ معصوم ہستی ہے جس کی طاعت فرض ہے، اور جس پر باطنی وحی آتی ہے، اور حقیقت میں یہی نبی کی تعریف ہے، اس لئے ان کا مذہب ختم نبوت کے انکار کا مستلزم ہے۔[1]

ایک آفتابِ عالمتاب باقی سب تابندہ ذرات

جہاں تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی کا تعلق ہے، آپ کی ذات کے ساتھ صرف ضابطہ و قانون کا تعلق کافی نہیں، روحانی و جذباتی تعلق اور ایسی گہری و دائمی محبت مطلوب ہے، جو جان و مال اور اہل و عیال کی محبت پر فوقیت لے جائے، اور خدا کے بعد کسی کی شخصیت آپؐ کے سامنے (چاہے وہ اقطاب و ابدال ہوں چاہے کملاء و فضلائے اہلِ بیت)

---

[1] الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین ص۴-۵ مطبوعہ مطبع احمدی دہلی۔

نہ جچے، اور اس پر اقبال کے الفاظ میں یقین ہو کہ آپ نے ۔ ع

غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

آپؐ آفتاب عالم تاب ہیں، اور صحابۂ کرامؓ ہوں یا افرادِ اہلِ بیت، ائمہ مجتہدین ہوں کہ مُصلحین و مجدّدین، بانیانِ سلطنت ہوں یا داعیانِ انقلاب، سب ذرّات ہیں جو اس آفتاب عالم تاب کی روشنی سے روشن ہوئے اور خاک سے اکسیر اور لوہے سے پارس بن گئے، بقول شاعر ؎

سر سبز سبزہ ہو جو ترا پائمال ہو
ٹھہرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

حضرات شیعہ کے یہاں منقبت و نعت میں آمد و آورد کا فرق

لیکن امامت و امام کے بارے میں یہ عقائد اس سے نہ صرف یہ کہ غیر مطابق بلکہ متضاد و متحارب ہیں، اُن کا قدرتی یا نفسیاتی نتیجہ ہے کہ حضرات شیعہ کے قلم سے نہ کوئی پُر اثر اور طاقتور سیرت کی کتاب نکلتی ہے، نہ ان کے شعرائے باکمال کی زبان سے نعت میں وہ سوز و ساز اور وہ دل کی آواز نظر آتی ہے جو مراثی و مناقبِ اہلِ بیت میں، اور واقعہ کربلا کی تصویر کشی اور ساحری میں ملتی ہے، نہ ان کے یہاں کوئی ایسا نعت گو شاعر پیدا ہوا جس کو اگر قدسیؔ اور جامیؔ کے سامنے نہیں تو امیر مینائیؔ، الطاف حسین حالیؔ، محسنؔ کاکوروی، محمد اقبالؔ اور ظفر علی خاں کے سامنے رکھا جا سکے، اور یہ بات بالکل قرینِ قیاس، اور قابلِ فہم ہے، راقم سطور نے اپنے سفرنامہ "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" میں اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا

یہاں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے :۔

"حضرات ائمہ اہل بیت ہمیشہ تاریکی میں مینارۂ نور، اور ہدایت و رہنمائی کے امام رہے ہیں، اس میں کسی صحیح العقیدہ مسلمان کو شک نہیں ہو سکتا، لیکن ہمارا احساس یہ ہے کہ شیعہ حضرات کا ان ائمۂ اہلِ بیت سے اتنا غیر معمولی جذباتی تعلق، اور اہلِ بیت کی محبت میں حد سے بڑھا ہوا انہماک عقل و جذبات اور ضمیر پر غالب آگیا ہے، اور ہمارا تأثر یہ ہے کہ اس شیفتگی و شغف نے اس تعلق و محبت کو کسی حد تک مجروح اور کمزور کر دیا ہے، جو نبوتِ محمدیؐ اور ذات نبویؐ کے ساتھ ہر مسلمان کا ہونا چاہیے جس کی وجہ سے اہلِ بیت نے عزت و شرف کا مقام حاصل کیا، اور وہ ہماری محبت و تعظیم کے مستحق قرار پائے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اندرونی ربط و تعلق کا ایک حصہ (کوٹا) جو اس ذات گرامیؐ کے ساتھ مخصوص تھا، اس تعلق (اہلِ بیت کے کوٹے) میں داخل ہو گیا۔

چنانچہ ایران کے اخیر دور کے نعتیہ کلام میں (جس کی کچھ زیادہ مقدار نہیں ہے) وہ جوش و خروش، طبیعت کی روانی اور مضامین کی آمد نہیں ہے جو ان نظموں میں نظر آتی ہے، جو مناقب اہل بیت، مرثیے، اور خاص طور پر سیدنا علی مرتضیٰؓ اور حضرت حسینؓ کی مدح و توصیف اور مصائب اہلِ بیت کے بیان میں کہی گئی ہیں، یہ فرق شیعہ حضرات کے یہاں ہر جگہ نعت نبویؐ، اور اہلِ بیت کی مدح و توصیف کے درمیان دیکھا جا سکتا ہے، اردو میں انیس و دبیر کے مرثیے پڑھیے، اور اس کا خود ان کے

اور دوسرے شعراء کے نعتیہ کلام سے مقابلہ کیجئے، جو ان کے ہم مسلک اور ہم مذہب تھے، دونوں میں آمد و آورد، اور اصلی و ضمنی کا فرق محسوس ہوگا، کم و بیش یہی فرق سیرت نبویؐ، اور مناقبِ اہل بیت میں پایا جاتا ہے، یہی چیز ہم نے ایران میں دیکھی کہ وہاں مشاہد و مقابر سے جو تعلق ہے، وہ مساجد سے نہیں معلوم ہوتا، نجف و کربلا، اور عتبات عالیہ کے سفر کا جو شوق ہے وہ حرمین شریفین کی زیارت اور سفر حج کے سلسلہ میں نظر نہیں آتا۔

ہو سکتا ہے، ہمارے اثنا عشری بھائیوں میں یہ ردِّ عمل اہلِ سنّت کے بعض علماء اور پُرجوش حضرات کے رویّہ، اور اہلِ بیت کے حقوق کے اعتراف میں کوتاہی سے ہوا ہو، لیکن یہ بات ردِّ عمل سے کچھ آگے بڑھی ہوئی ہے، محبت و عقیدت، جوش و جذبہ اور تقدیس و تعظیم کا جو ہالہ اس روحانی مرکز کے گرد بن گیا ہے، اور اس کی مدح و توصیف میں جس مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے، اس سے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ چیز امامت کو نبوت کا حریف اور اس کی بہت سی صفات و خصوصیات میں شریک و سہیم نہ بنا دے اگر ایسا ہوا تو پوری زندگی کا دھارا ایک ایسے مرکز کی طرف ہو جائے گا، جو افضل الانبیاءؑ خاتم النبیین رسول اکرم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پہلو بہ پہلو پروان چڑھے گا۔[1]

ائمہ اہلِ بیت کی توہین آمیز اور حوصلہ شکن تصویر

ائمہ اہلِ بیت کے بارے میں ایسے غالیانہ عقائد و بیانات کے ساتھ جو ان کو

---

[1] "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" ص۱۰۵-۱۰۶ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ ۱۹۷۶ء

مافوق البشر ہستی ثابت کرتے ہیں، اور بعض حیثیتوں سے ان میں بعض صفات اُلوہیت پیدا کر دیتے ہیں، کُتُبِ شیعہ میں ان کی ایسی تصویر پیش کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ (خاکم بدہن، مع حضرت علیؓ شیرِ خدا کے) شجاعت کے جوہر اور اعلان حق کی جرأت سے محروم خطرات و مخاوف سے لرزاں و ترساں مسلسل طریقہ پر حق پوشی، مصلحت اندیشی سے کام لینے والے، تقیہ کو نہ صرف ایک وقتی ضرورت اور حفاظتِ خود اختیاری کا ہتھیار سمجھنے والے بلکہ اس کو عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ جاننے والے[1] اور اس سے بضرورت و بلا ضرورت کام لینے والے، امت محمدیؐ کو (تھوڑا سا خطرہ مول لے کر) اصل تعلیمات نبویؐ کے علم سے دور اور اپنے کو تھوڑے سے خطرہ میں ڈال کر دین کو عزت و غلبہ سے محروم رکھنے والے ہیں، ان کتبِ مناقب و فضائل سے ان ائمۂ والا شان کی (أعاذهم الله) جو تصویر سامنے آتی ہے وہ فری میسن (FREE MASON) جمعیۃ اخوان الصفا[2] اور مختلف ملکوں کے خفیہ اور

---

[1] امام جعفر صادق کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے مرید صادق سلمان سے فرمایا "یا سلیمان انكم على دين من كتمه أعزّه الله ومن أذاعه أذلّه الله" (اے سلمان تم ایسے دین پر ہو جو چھپائیگا، اللہ اس کو عزت دے گا، اور جو اس کو پھیلائیگا اللہ اس کو ذلیل کرے گا) خود امام باقر کا ارشاد نقل کیا گیا ہے "انّ أحبّ أصحابي إليّ أورعهم وأفقههم وأكتمهم لحديثنا" (میرے رفقاء خدام میں مجھے سب سے محبوب وہ ہے اور وہی سب سے زیادہ متقی و فقیہ ہے جو ہمارے کلام کو زیادہ چھپانے والا ہے) "اصول کافی" ص ۴۸۵-۴۸۶ "اصول کافی" میں یہاں تک آیا ہے "دین کا ۹/۱۰ تقیہ ہے اور جو تقیہ نہیں کرتا اس کے پاس دین نہیں (ص ۴۸۲)۔

[2] یہ عہد عباسی میں آزاد فلسفیانہ خیالات رکھنے والوں کی (جن میں ایک تعداد اطباء کی تھی) ایک خُفیہ تنظیم تھی، انھوں نے اپنا نام "اخوان الصفا" رکھا تھا (باقی ص ۹۵ پر)

زیر زمین (UNDERGROUND) تنظیموں سے قطعاً مختلف نہیں، اور اس کو پڑھ کر انسان کے دل میں وہ حوصلہ مندی، شانِ عزیمت، اشاعتِ دین اور غلبہ اسلام کے لئے مہم جوئی اور خطر پسندی کی روح پیدا نہیں ہوتی جس نے اسلام کی چودہ سو (۱۴۰۰) برس کی تاریخ میں مختلف تاریک زمانوں اور مایوس کن حالات میں واقعات کا دھارا بدل دیا اور تاریخ کو نیا رخ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا[۱]، اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ — ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی[۲]

اہلِ بیت کی سیرت و کردار تاریخ کے آئینہ میں

خاندانِ نبوت کے افراد، اہلِ بیت کرام، سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور ان کی اولادِ امجاد

(باقی ص۸۱ کا) چوتھی صدی ہجری میں بغداد ان کا مرکز تھا، یہ مخفی طریقہ پر جمع ہوتے تھے اور فلسفیانہ مباحث اور آزادانہ خیالات پر تبادلہ خیال کرتے تھے، قانون یہ تھا کہ معین اوقات میں ان کی نشست ہوتی تھی، اس میں کوئی اجنبی آدمی شامل نہیں ہونے پاتا تھا، انھوں نے باون (۵۲) خطوط کی شکل میں اپنے فلسفہ کو مدون کیا ہے، جو "رسائل اخوان الصفا" کے نام سے مشہور ہیں، لکھنے والوں نے اپنے نام مخفی رکھے ہیں، معتزلہ اور ان کے ہم مذاق لوگ ان خطوط کی نقلیں لیتے تھے، اور ان کو مخفی طریقہ پر اسلامی ممالک میں لے جاتے تھے، ۱۸۸۳ء میں لیبزج میں، ۱۸۸۶ء میں بمبئی میں، ۱۸۸۹ء میں مصر میں ان کی اشاعت ہوئی، (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ فلاسفۃ الاسلام فی المشرق والمغرب" تالیف محمد لطفی جمعہ ص۲۵۳-۲۶۶) مکتبۃ المعارف قاہرہ ۱۹۲۷ء

[۱] ملاحظہ ہو راقم کی کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" جلد ۱ تا ۵ [۲] بال جبریل۔

اپنی اس نسبت گرامی کے بارہ میں جو ان کو سرورِ کائنات، مفخرِ موجودات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے حاصل تھی بڑے غیور، خوددار واقع ہوئے تھے، وہ دوسرے مذاہب اور قوموں کے دینی پیشواؤں کے خاندانوں اور فرزندوں کی طرح جن کو ان مذاہب کے پیرو ہر حال میں عظمت و تقدیس کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کے ساتھ مافوق البشر ہستیوں کا سا معاملہ کرتے ہیں، اپنی اس نسبت و نسب سے کوئی دنیاوی فائدہ نہیں اٹھاتے تھے، اور "استخواں فروشی" اور مفت خوری سے کوسوں دور رہتے تھے، تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں ان کی خودداری، عزّتِ نفس اور استغنا و بے نیازی کے جو واقعات آئے ہیں اُن سے ان کی سیرت و کردار کا جو نقشہ سامنے آتا ہے، وہ دوسرے ادیان و ملل کے اس دینی طبقے (برہمنوں اور پُروہتوں) سے بہت مختلف ہے، جن کو پیدائشی تقدّس اور عظمت حاصل ہوتی ہے، اور جن کو اپنی ضروریات زندگی کی تکمیل کے لئے کسی محنت و کوشش کی ضرورت نہیں ہوتی، اس سلسلہ کے چند واقعات لکھے جاتے ہیں، جن سے کسی قدر اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سیدنا حسن بن علی کسی ضرورت سے بازار گئے انھوں نے ایک دکان سے کچھ مال خریدنا چاہا، دکاندار نے اس کے اصل دام بتائے پھر کسی کے اشارہ کرنے سے یا کسی قرینہ سے اس کو علم ہو گیا کہ یہ نواسۂ رسول حسن بن علیؓ ہیں، اس نے فوراً دام کم کر دیئے اور خصوصی رعایت کرنی چاہی، حضرت حسنؓ مال چھوڑ کر واپس آگئے اور فرمایا کہ میں اپنی نسبت سے یہ فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا کہ میرے ساتھ رعایت کی جائے۔

سیدنا علی بن حسینؓ (زین العابدین) کے رفیق و خادم خاص جُویریۃ بن اسماء

کہتے ہیں کہ آپ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قربت کی بنیاد پر کبھی ایک درہم کا بھی فائدہ نہیں اٹھایا، "ما أكل علي بن الحسين بقرابته من رسول الله (صلى الله عليه وآله وسلم) درهماً قط۔"[1]

یہی سیدنا علی زین العابدین جب سفر کرتے تھے تو اپنے نام و نسب کا اظہار ہونے نہیں دیتے تھے، لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا مجھے یہ بات ناپسند ہے کہ میں اس نسبت سے فائدہ اٹھاؤں اور دوسروں کو فائدہ نہ پہونچاؤں[2] (اور یہ بات سفر میں ممکن نہیں)۔

حضرات اہل بیت اور شیر خدا حضرت علیؓ کے ابناء و احفاد اس جوہر شجاعت و شہامت سے آراستہ تھے، جو خاندان نبوت کا شعار اور سیدنا علی مرتضیٰ اور حضرت حسین شہید کربلا کی میراث تھی، ان کا عمل عزیمت، جرأت کے ساتھ اعلانِ حق، حفاظتِ دین اور مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کے سلسلہ میں ہر طرح کے خطرات برداشت کرنے اور اپنے اور اپنے اہل تعلق کے مصائب میں مبتلا ہونے کی پروا نہ کرنے پر تھا، سیدنا علی زین العابدین کے صاحبزادے زید بن علی نے ۱۲۲ھ میں خلیفۂ اموی ہشام بن عبد الملک بن مروان کی حکومت میں (جو اپنے وقت کی عظیم ترین اور مستحکم ترین حکومت تھی) خروج کیا اور حکومت کی بڑی بڑی فوجوں پر فتح پائی آخر میں شہادت سے سرخرو ہوئے ان کو سولی دی گئی اور چار سال تک مصلوب رہے۔[3]

رجب ۱۴۵ھ میں حضرت حسن کے پرپوتے محمد بن عبد اللہ المحض بن حسن المثنیٰ بن

---

[1] البداية والنهاية لابن كثير ج ۹ ص ۱۰۶ [2] وفيات الأعيان لابن خلكان مطبعة النهضة ۱۹۴۸ء
[3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتب تاریخ ابن جریر طبری، ابن اثیر اور ابن کثیر۔

حسن بن علی بن ابی طالب معروف بذوالنفس الزکیہؒ نے خلیفہ منصور عباسی کے خلاف مدینہ طیبہ میں خروج کیا اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ نے ذی الحجہ ۱۴۵ھ میں بصرہ میں منصور کے خلاف علم جہاد بلند کیا اسلام کے دو عظیم ترین فقہی مکاتب مذہب مالکی و مذہب حنفی کے دونوں جلیل القدر اماموں، امام مالک اور امام ابو حنیفہ نے ان کی بیعت و حمایت کا فتوی دیا[۱] امام ابو حنیفہ نے مالی نذرانہ بھی پیش کر کے اپنی حمایت و نصرت کا اظہار فرمایا، جو بعد میں منصور کے عتاب و سرزنش کا سبب بنا محمد ذوالنفس الزکیہ نے ۱۵ رمضان ۱۴۵ھ کو "احجار الزیت" کے مقام پر جو مدینہ منورہ میں واقع ہے بڑے مردانہ و سرفروشانہ طریقہ پر شہادت پائی اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ نے ۲۴ ذی الحجہ ۱۴۵ھ میں کوفہ میں خلعت شہادت زیب تن کیا۔

اس کے برعکس ایسی کثیر التعداد تاریخی روایات ہیں جن سے حضرات اہل بیت کی بلند ہمتی، عزیمت پر عمل، مسلمانوں کی شیرازہ بندی اور اجتماعیت فکر کی روشن شہادتیں ملتی ہیں، بابکیؔ جو حضرت زید بن علی بن حسین کے خدام و رفقاء میں سے تھے، بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت زید کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوا، جب نصف شب ہوئی اور ثریا (ستارہ) آسمان پر صاف نظر آنے لگا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ بابکی تم ثریا کو دیکھتے ہو، تمھارے خیال میں

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی فاضلانہ محققانہ کتاب "امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی" ص ۳۴۰ تا ۳۴۸ و ص ۴۲۳ تا ۴۳۰۔ امام ابو حنیفہ نے امام زید بن علی کی بھی علانیہ حمایت فرمائی تھی اور ان کے خروج کو حق بجانب ثابت کیا تھا ایضاً ص ۱۵۱ - ۱۵۲

کوئی وہاں تک پہونچ سکتا ہے؟ میں نے کہا نہیں! انھوں نے فرمایا خدا کی قسم میری تمنا ہے کہ میرا ہاتھ اس پر ہو اور میں اس بلندی سے زمین پر گروں جہاں بھی موقع ہو اور میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں مگر اللہ تعالیٰ رسول اللہؐ کی کی امت میں صلح و اتحاد کرادے۔[1]

بعض مصنفین اور "محبّین اہل بیت" بزرگانِ اہل بیت کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں، جیسے ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اور دلچسپی غاصبین کے ہاتھ سے خلافت کا نکال لینا ہی تھا، یہی ان کا مقصدِ حیات اور مشغلۂ زندگی تھا، اور یہی ان کے اعصاب اور قوئ فکریہ پر مستولی رہتا تھا، ان کو اُمّتِ محمدی، اسلامی معاشرہ سے کوئی دلچسپی، اس کی تربیت و اصلاح کی کوئی فکر، زہد و عبادت اور تبلیغ و دعوت سے کوئی سروکار نہ تھا، لیکن وہ تاریخ جو رنگ آمیزی سے پاک رہی ہے، وہ ان کی ایسی تصویر پیش کرتی ہے جو ان کے نسب و نسبت اور ان کے مقامِ عالی کے ہر طرح شایانِ شان اور قابلِ قیاس ہے، یہاں پر صرف حضرت جعفر صادق کی سیرت و کردار، ان کے اخلاق و شمائل، ان کی پاکیزہ نفسی، دنیاوی اغراض و مقاصد سے بے نیازی، اعلیٰ درجہ کے تقویٰ اور احتیاط اور دنیا سے بے رغبتی اور آخرت طلبی کا اندازہ ہوتا ہے۔

امام مالک ان کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں، میں حضرت جعفر بن محمد کی خدمت میں حاضر ہوتا، وہ اکثر متوسم رہتے لیکن جس وقت آنحضرت صلعم کا

---

[1] مقاتل الطالبین (لأبي الفرج الأصبهاني) ص ۱۲۹ دار المعرفة، بیروت۔

نام نامی ان کی مجلس میں لیا جاتا تو چہرہ کا رنگ زرد و سبز ہو جاتا، میں عرصہ تک ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا، جب کبھی دیکھتا انھیں باتوں سے خالی نہ پاتا یا نماز میں مشغول ہیں یا روزے سے ہیں یا قرآن شریف کی تلاوت فرمارہے ہیں، میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ بغیر طہارت کے انھوں نے کوئی حدیث بیان کی ہو، وہ کبھی غیر متعلق غیر ضروری بات نہ فرماتے، وہ ان عابدوں، زاہدوں میں تھے، جن پر خشیتِ الٰہی کا غلبہ ہوتا ہے۔[1]

امام جعفر کے اقوال وارشادات میں سے ہے کہ فرماتے تھے کہ "دین کے بارے میں کبھی بحث و جدال سے کام نہ لو اس لئے کہ اس سے شک پیدا ہوتا ہے، اور نفاق کی آبیاری ہوتی ہے"[2] یہی حال ان کے ان اخلاف کرام کا تھا، جن کو اہلِ سنت اپنے اپنے عہد کے کبار اولیاء اللہ، علماء ربانی، مصلح و داعیِ دین اور امت کے لئے فکرمند و ساعی سمجھتے ہیں، اور حضرات امامیہ ان کو ائمۂ اثنا عشر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اندازہ ہوتا ہے کہ ان ساداتِ کرام نے جن کی رگوں میں ہاشمی خون تھا، جب پورے طور پر اس کا اندازہ کر لیا کہ اب خلفاء بنی عباس کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنا جن کی حکومت ایشیاء وافریقہ کے وسیع اور متمدن ممالک پر حاوی تھی، اور جن کے زیر سایہ اسلام دُور دراز کے ملکوں تک پہونچ رہا تھا، اور مرکز خلافت میں بھی امن وامان قائم تھا علم دین کی اشاعت ہو رہی تھی اور اسلام کی تعلیمات و نظام کا بہت سا حصہ قائم تھا، انھوں نے کسی ایسی خوں ریزی وانتشار انگیزی سے

---

[1] الامام الصادق، علامہ ابوزہرہ۔ ص۷۶-۷۷ [2] ایضاً ص۶

احتراز کیا، جس سے بظاہر (ان کے خاندان کے پیشرو اصحاب جلادت وفتوّت کی کوششوں کی طرح) کسی بڑے نتیجہ کے نکلنے کی امید نہیں تھی، ان کی یہ خاموشی اور مسلمانوں کی دینی نگرانی، باطنی واخلاقی رہنمائی کے کام میں مشغولیت وسرگرمی نہ کسی سہولت پسندی اور عافیت کوشی پر مبنی تھی، نہ اس اصول تقیّہ پر عمل کرنے پر جس پر عمل وتلقین کی نسبت ان کی بلند شخصیتوں کی طرف کی گئی ہے، اور جس کے سلسلہ کے بعض اقوال وہدایات اوپر گذر چکی ہیں۔

مصنف نے اپنی کتاب "تاریخ دعوت وعزیمت" (حصۂ اول) میں اس تاریخی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس کا یہاں نقل کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے :۔

"بنی امیّہ (اور بنی عبّاس) کے اس مادّی اقتدار اور اس کے قدرتی اثرات کے باوجود اس عہد تک دین کا وقار، اس کا اخلاقی اثر کسی حد تک مسلمانوں کی زندگی میں قائم تھا، یہ دینی وقار اور اخلاقی اثر ان اشخاص کی بدولت تھا، جو دینی وعلمی حیثیت سے بلند مقام رکھتے تھے، اور اپنی للّٰہیت، اخلاص، پاکیزہ نفسی اور علم وتفقّہ میں مشہور ومعروف تھے، حکومت وانتظامات کے دائرہ سے باہر انہی حضرات کا اثر واقتدار تھا، اس اثر اور قلبی احترام کی وجہ سے مسلمان بہت سی خرابیوں اور گمراہیوں سے محفوظ تھے، اور مادّیت کے سیلاب میں بالکل بہ جانے سے رکے ہوئے تھے۔

ان دینی شخصیتوں میں سب سے بااثر اور محبوب شخصیت حضرت علی بن الحسین (زین العابدین علیہ وعلیٰ آبائہ السلام) کی تھی، جو عبادت وتقویٰ اور

زہد وورع میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے مسلمانوں کو ان کے ساتھ جو تعلق تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ہشام بن عبد الملک اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں طواف کے لئے آیا، شدتِ ہجوم کی وجہ سے وہ حجر اسود تک نہیں پہونچ سکا، اور اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ مجمع کچھ کم ہو تو وہ استلام کرے، اس درمیان میں حضرت علی بن الحسین آئے، ان کا آنا تھا کہ مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا اور انھوں نے بآسانی طواف و استلام کیا، وہ جدھر سے گذرتے، لوگ احتراماً راستہ چھوڑ دیتے تھے، ہشام نے انجان بن کر پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ عہد اموی کے مشہور شاعر فرزدق نے برجستہ اشعار میں اس کے تجاہلِ عارفانہ کا جواب دیا، اور ان کا شایانِ شان تعارف کرایا۔[1]

اسی طرح دوسرے فضلاء اہل بیت حضرت حسن المثنیٰ، اور ان کے صاحبزادہ حضرت عبد اللہ المحض نیز دوسرے فضلائے تابعین حضرت سالم بن عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ، حضرت سعید بن المسیّبؒ، حضرت عروہ بن الزبیرؓ[2] مسلمانوں کے لئے دینی نمونہ (آئیڈیل) تھے، انھوں نے اپنی خودداری، حکومت سے بے تعلقی، حق گوئی اور بے باکی، علمی انہماک اور بے غرض خدمتِ دین سے اپنی اخلاقی برتری کا نقش قائم کر دیا تھا۔

---

[1] یہ قصیدہ اب بھی عربی ادب میں یادگار ہے اس کا مطلع ہے۔

هذا الذی تعرف البطحاء وطأته ۔۔۔ والبیت یعرفه والحِلُّ والحرم

محققین کا خیال ہے کہ اس قصیدہ میں بہت سے اشعار بعد میں اضافہ ہوئے ہیں۔

[2] مفصل حالات و تراجم کے لئے ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ للذہبی صفوۃ الصفوۃ لابن الجوزی اور تاریخ ابن خلکان۔

حکومت کے بڑھتے ہوئے، ہمہ گیر اثرات کے مقابلہ میں یہ اخلاقی اثر اگرچہ کافی نہ تھا، مگر اس میں شبہ نہیں کہ وہ بے قیمت اور بے نتیجہ نہ تھا، اس سے مسلمانوں کی زندگی میں کسی حد تک اعتدال و توازن اور دین کا احترام قائم تھا، اور کبھی کبھی عین دنیاوی انہماک میں بھی اصلاح حال کا جذبہ ابھرتا تھا۔"[1]

اسلام اور مسلمانوں کے عہدِ اول کی دو متضاد تصویریں

اسلام کا اوّلین اور مثالی عہد کیسا تھا، خدا کے سب سے بڑے اور آخری پیغمبر کی تعلیم و تربیت کے عملی نتائج کیا نکلے؟ اور ان انسانوں کی سیرت و کردار کا کیا حال تھا جنھوں نے آغوشِ نبوت اور دامنِ رسالت میں تربیت پائی تھی، قومی، نسلی اور خاندانی سلطنتوں کے بانیوں اور حصول اقتدار کے خواہشمندوں سے اس کو کچھ امتیاز، حاصل تھا یا نہیں؟ اس کا اپنے خاندان کے معاملہ میں طرزِ عمل، اور خود اس خاندان کا اس کی مقدّس و عظیم شخصیت سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں رویّہ کیا تھا؟ دین کی دعوت، صداقت و حقیقت کے اعلان، اور عزیمت پر عمل کرنے کے بارے میں اہل بیت کی سیرت و کردار کیا نظر آتا ہے؟ اور پھر ان اوّلین مسلمانوں اور نبی کے تربیت یافتہ گروہ کے (جن میں اس کے صحبت یافتہ لوگ بھی تھے جن کو "صحابہ" کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے، اور اس کے گھر کے افراد بھی تھے، جن کو "اہلِ بیت" کے لقب سے پکارا جاتا ہے) باہمی تعلّقات کی نوعیت کیا تھی؟ اس مثالی عہد میں جن لوگوں کے ہاتھوں میں زمامِ کار و اقتدار آئی، (جن کو خلفائے راشدین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) عیش و راحت اور مرفّہ الحالی کے وسیع امکانات اور غیر محدود اختیارات کی

[1] تاریخ دعوت و عزیمت حصۂ اول صـ۳۲ و ۳۳

موجودگی میں اُن کا شخصی و خانگی زندگی میں طرزِ عمل اور اپنے وسیع حدودِ حکومت میں مخلوقِ خدا کے ساتھ معاملہ معتبر تاریخ کی روشنی میں کیا ثابت ہوتا ہے؟ جس آسمانی صحیفہ پر اس پورے دین کی اساس ہے، اس کی صحت و حفاظت کی حقیقت کیا ہے؟

ان سوالات کے جو جواب دیئے گئے ہیں، اُن سے دو متقابل و متضاد تصویریں بنتی ہیں، جو پچھلی سطور میں پیش کی گئیں، ایک تصویر وہ ہے، جو اہلِ سنّت کے عقائد کی روشنی میں دنیا کے سامنے آتی ہے، دوسری وہ جو فرقۂ امامیہ اثنا عشریہ کے عقائد و بیانات اور ان کے دین کی تشریح اور تاریخ اسلام کی تعبیر اور اس کے خاص تصوّر سے تیار ہوتی ہے، ان دونوں تصویروں میں کوئی مماثلت و اتفاق نہیں ہے۔

اب ہر وہ شخص جس کو اللہ نے عقلِ سلیم، انصاف کا مادّہ اور انسانی تاریخ سے واقفیت کا موقعہ عطا کیا ہے، آسانی سے فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان میں سے کون سی تصویر ایک ایسے دین کے لئے موزوں و قابلِ قبول ہو سکتی ہے، جو ساری دنیا کے لئے رحمت و ہدایت بنا کر بھیجا گیا ہے، اور جو اس بات کا مدّعی ہے کہ اس دین پر ہر زمانہ میں عمل ہو سکتا ہے، اور اس سے بہترین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں، اور جس کا عقیدہ و اعلان ہے کہ اس دین کے دنیا میں لانے والے پیغمبر کو اپنی کوششوں میں سب سے زیادہ کامیابی ہوئی، اور اس کا عہد اس دین اور دعوت کی تاریخ میں ہر عہد سے زیادہ باسعادت و بابرکت تھا (اور عقل و نقل کے لحاظ سے ایسا ہی ہونا چاہیئے) اس سے بہتر اُس انسانیت کے لئے کون سی تصویر قابلِ فخر و مفید ہو سکتی ہے، جس کی تاریخ زیادہ تر "نائے و نوش" بعیش کوش، ذاتی اور قومی اغراض کے لئے جنگ و جدال، حصولِ اقتدار کے لئے جدّ و جہد اور پھر اقتدار سے

فائدہ اٹھانے اور اپنے وابستگان کو فائدہ پہونچانے کی تاریخ ہے، اسلام کے اس دورِ اول میں افراد ہی نہیں ایک پورا انسانی معاشرہ، تمدّن، نظامِ حکومت اور طرزِ زندگی، اعلیٰ اقدار، بے لچک اصولوں، ہدایتِ عام اور فلاحِ انسانی کی بنیاد پر قائم ہوا، اور وہ خلیفۂ راشد سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے اس قول کی تصدیق و تصویر تھی، جو انھوں نے ایک موقعہ پر فرمایا تھا "ان محمداً صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انما بُعِثَ ھادیا ولم یُبعَث جابیاً"[1] (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، جابی (تحصیلدار اور محصّل خراج) بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔)

اس کے برخلاف فرقۂ امامیہ کے عقائد اور بیانات کی روشنی میں اوّلین مسلمانوں کی جو تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے، اس کے پیشِ نظر ایک ذہین تعلیم یافتہ شخص یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہے کہ جب اسلامی دعوت اپنے سب سے بڑے داعی کے ہاتھوں اپنے دورِ عُروج میں کوئی دیرپا اور گہرا نقش مرتّب نہ کرسکی، اور جب اس دعوت پر ایمان لانے والے اپنے نبی کی آنکھ بند ہوتے ہی اسلام کے وفادار اور امین نہ رہ سکے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس صراطِ مستقیم پر اپنے متبعین کو چھوڑا تھا، اس میں سے گنتی کے چار آدمی اس پر قائم رہے تو ہم یہ کیسے تسلیم کرلیں کہ اس دین و دعوت کے اندر نفوسِ انسانی کے تزکیہ اور تہذیبِ اخلاق کی صلاحیت ہے، وہ انسان کو حیوانیت کی پستی سے نکال کر انسانیت کی بلند چوٹی تک پہونچا سکتی ہے، فرض کیجئے اسلام کا ایک نمائندہ مغربی ممالک کے کسی مرکزی مقام پر یا کسی غیر مسلم ملک میں

---

[1] کتاب الخراج امام ابویوسف ص۷۵

اسلام کی صداقت پر سحر انگیز تقریر کررہا ہے' ایک شخص جس نے مذہب اثنا عشری کی کتابیں پڑھی ہیں' اس کو برملا ٹوک دیتا ہے اور کہتا ہے کہ پہلے اپنے گھر کو دیکھئے اور اپنی خبر لیجئے، آپ کے نبی کی تیئیس ۲۳ سالہ محنتِ شاقہ کا نتیجہ صرف چار پانچ ہیں' جو آپ کی وفات کے بعد آپ کے راستہ پر گامزن رہے' آپ کس منہ سے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں' اور ان کے ثبات و استقامت کی کیا ضمانت ہے؟ کیا اس کا جواب ممکن ہے؟

آیت اللہ خمینی صاحب کی عقائد شیعہ پر استقامت اور علانیہ اظہار و دعوت

پچھلے برسوں میں جب آیت اللہ روح اللہ خمینی صاحب نے اسلامی انقلاب کی دعوت دی اور "پہلوی" سلطنت کا تختہ الٹ کر (بقول خود) حکومتِ اسلامیہ قائم کی اور ایک نئے دور کا آغاز کیا تو اس کی پوری توقع تھی (اور اس کے پورے آثار و قرائن موجود تھے) کہ وہ اپنی دعوت کو عام کرنے اور اس کو مقبول بنانے کے لئے شیعہ سنی اختلاف کی قدیم و مسلسل تاریخ کا یہ نزاعی ورق نہ کھولیں گے، اور اگر اس کو کتاب سے جدا نہیں کرسکتے تو کم سے کم اس کو الٹیں گے نہیں' اور اگر فرقۂ امامیہ کے ان عقائد سے وہ کسی سیاسی یا مقامی مصلحت سے براءت کا اعلان نہیں کرسکتے تو کم سے کم ان کا اظہار و اعلان نہ کریں گے، بلکہ ان جیسے جری سربکف دینی پیشوا سے (جس نے اپنی بے خوفی' عواقب و نتائج سے بے پرواہی اور آتش بیانی سے اس سلطنت پہلوی کا تختہ الٹ دیا' جس کی فوجی طاقت اور اپنی بقا و استحکام کے لئے وسیع انتظامات دنیا کو معلوم ہیں) امید تھی کہ وہ اخلاقی

جرءت اور اتحادِ مسلمین کی خاطر اور اپنے گہرے فکر و مطالعہ کی بنیاد پر یہ اعلان کر دے گا کہ یہ عقائد جو اسلام کی بنیاد پر تیشہ چلاتے ہیں، اور اس کو دنیا میں بدنام اور بے اعتبار کرتے ہیں، اور جو غیر مسلمین کو دعوت دینے کے راستہ میں سنگِ گراں ہیں[1]، اور جو قرنِ اول اور صحابہؓ کے عہد کی ایک دشمنِ اسلام چالاک سازش کے نتیجہ میں اور صدیوں کی قائم شدہ ایرانی شہنشاہی کے زوال کے انتقام کے جذبہ سے بروئے کار آئے تھے، اب ان کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش، ہم کو اسلام کا اقتدار قائم کرنے، ممالکِ اسلامیہ کی اصلاح اور مسلم معاشرہ سے فساد دور کرنے کے لئے اب ماضی کو بھول جانا چاہیئے اور ایک نئے سفر کا آغاز کرنا چاہیئے، جس میں اسلام کی ماضی و حال کی تابناک تصویر دنیا کے سامنے آئے، اور دنیا کی دوسری قومیں اسلام کی طرف مائل ہوں۔

لیکن توقعات اور آثار و قرائن کے بالکل برعکس ان کے قلم کی خود وہ تحریریں اور رسائل اور کتابیں سامنے آئیں جن میں انھوں نے پوری صفائی اور طاقت کے ساتھ انھیں شیعی عقائد کا اظہار کیا ہے، ان کی کتاب "الحکومۃ الإسلامیۃ، ولایۃ الفقیہ" میں امامت اور ائمہ کے بارے میں وہی خیالات ظاہر کئے گئے ہیں جو ان کو مقامِ الوہیت تک

---

[1] اس لئے کہ ان کا ماحصل یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کی اس جماعت میں جس کی تعداد صرف حجۃ الوداع میں ایک لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے، اپنے پیغمبر کی آنکھ بند ہونے کے بعد صرف چار آدمی اسلام پر قائم رہے، باقی سب نے معاذ اللہ ارتداد کا راستہ اختیار کیا، قرآن مجید سرتاپا محرّف و تبدیل شدہ ہے، ائمہ اہلِ بیت (از روئے تقیہ جو دینی فریضہ اور عزیمت ہے) حق کے چھپانے والے، اصل قرآن کو پوشیدہ رکھنے والے، ہر خطرہ و اندیشہ سے دور رہنے والے، اور اپنے متبعین کو اسی کی تلقین کرنے والے تھے (ملاحظہ ہو فرقہ اثنا عشریہ کی معتبر کتابیں، اصول کافی، فصل الخطاب، اور خود علامہ خمینی کی تصنیفات "کشف الاسرار" وغیرہ یا کتاب "ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" از مولانا محمد منظور صاحب نعمانی۔)

پہونچاتے ہیں اور ان کو ہر نبی و ملک سے افضل ثابت کرتے ہیں اور یہ کہ کائنات تکوینی طور پر ان کے تابع فرمان اور زیر اقتدار ہے[۱]، اسی طرح ان کی فارسی کتاب "کشف الاسرار" میں صحابۂ رسول بالخصوص خلفائے ثلاثہ کے متعلق جرح و تنقید ہی نہیں سب و شتم کے وہ الفاظ آئے ہیں جو کسی بڑی سے بڑی ضال و مضل، فاسق و فاجر، زائغ و مزیغ، اور سازشی جماعت کے لئے آسکتے ہیں[۲]، یہ دونوں چیزیں ان کی دعوت کے ساتھ چل رہی ہیں اور یہ کوئی خفیہ ہدایات یا پرائیوٹ خطوط کی شکل میں نہیں ہیں، مطبوعہ اور شائع شدہ رسائل کی شکل میں ہیں۔

خمینی صاحب کے حامیوں اور معتقدین کا عقیدہ سے صرفِ نظر

خمینی صاحب کی یہ دونوں چیزیں (امامت اور ائمہ کے بارے میں خیال، اور صحابہؓ پر طعن و الزام) کوئی چھپی ڈھکی چیز نہیں تھی، یہ رسائل ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ایران اور ایران سے باہر پھیل چکے ہیں، اس بناء پر اس بات کی پوری توقع تھی کہ عقیدہ و بنیاد کے اس اختلاف، امت کے بنیادی عقیدۂ توحید میں رخنہ اندازی "مشارکت فی النبوۃ (جو امامت کی تعریف اور ائمہ کے اوصاف کا لازمی و منطقی نتیجہ ہے) اور صحابہ کرامؓ کی شخصیتوں پر جو مسلمانوں کے یہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ قابلِ احترام اور قابلِ محبت شخصیتیں ہیں، اور جن کا دور تاریخ اسلام ہی میں نہیں تاریخ انسانی میں (مستند تاریخ کی روشنی میں اور مسلم و غیر مسلم مؤرخین کی

۱؎ الحکومۃ الاسلامیۃ ص۵۲ ۲؎ "کشف الاسرار" (فارسی) ص۱۱۳-۱۱۴

شفقہ شہادت کے مطابق) دنیا کا معیاری و مثالی دورِ حکومت اور نمونۂ زندگی تھا، طعن و تشنیع کے بعد کم سے کم اس حلقہ میں جو سنّی العقیدہ ہے (اور وہی مسلمانوں میں اکثریت کی حیثیت رکھتا ہے) ان کی دعوت مقبول نہیں ہو گی اور ان کو اسلامی انقلاب کا علمبردار، حکومت اسلامی کا مؤسّس و بانی، اور مثالی رہنما و قائد نہیں سمجھا جائے گا، لیکن یہ دیکھ کر صدمہ بھی ہوا اور حیرت بھی کہ بعض ایسے حلقوں میں جو فکر اسلامی کے علمبردار اور اسلام کے عروج و غلبہ کے داعی و متمنّی ہیں، ان کو ایک "امام منتظر" کی حیثیت دی گئی، اور ان سے ایسی عقیدت و محبت کا اظہار کیا گیا، جو اُس عصبیت کی حد تک پہونچ گئی ہے، جو تنقید کا ایک لفظ سننے کی روادار نہیں ہوتی، اس تجربہ اور مشاہدہ سے دو۲ باتوں کا اندازہ ہوا۔

اسلام میں عقیدہ کی اہمیت اور اس سے صَرفِ نظر کے خطرناک نتائج

۱۔ بہت سے حلقوں میں مدح و ذم اور تعریف و تنقید کا معیار کتاب و سنت، اسوۂ سلف اور عقائد اور مسلک کی صحت نہیں رہا، بلکہ اسلام کے نام پر مطلق حکومت کا قیام، طاقت کا حصول، کسی مغربی طاقت کو للکار دینا، اس کے لئے مشکلات پیدا کر دینا اس کو محبوب و مثالی قائد بنا دینے کے لئے کافی ہے۔

۲۔ عقیدہ کی اہمیت ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل میں خطرناک حد تک کم ہوتی جارہی ہے، اور یہ بڑی تشویش انگیز اور قابلِ فکر بات ہے، انبیاء اور غیر انبیاء کی دعوتوں میں ان کی جدّوجہد کے مقاصد اور محرکات میں سب سے بڑی حدِ فاصل یہی عقیدہ ہے جس پر وہ کسی سمجھوتہ اور اونے پونے سودا کر لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے، ان کے یہاں[1]

[1] اس کے دلائل اور مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو راقم سطور کی کتاب "دستورِ حیات" بعنوان "دین اسلام کا مزاج اور اس کی نمایاں خصوصیات" ص ۲۰

ردّ و قبول، پسندیدگی و ناپسندیدگی کا معیار اور وصل و فصل کی شرط ہی عقیدہ ہوتا ہے، یہ دین (جو مسلمانوں کی ساری کمزوریوں کے باوجود) اپنی اصلی شکل پر اس وقت تک موجود ہے، وہ اسی "عقیدہ" کے معاملہ میں صلابت و استقامت اور حمیت و غیرت کا رہین منت ہے، دین کے شارحین و محافظین نے اس سلسلہ میں کسی با جبروت طاقت اور کسی وسیع سے وسیع تر بادشاہی کے سامنے سپر نہیں ڈالی اور اس کے کسی غلط عقیدہ اور دعوے پر سکوت جائز نہیں سمجھا، چہ جائیکہ اس کو اسلام اور مسلمانوں کے دنیاوی منافع اور اختلاف و تفرقہ سے بچنے کی لالچ میں قبول کر لیتے یا ہمنوائی کرتے، امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ) کا "خلق قرآن" کے عقیدہ میں نہ صرف مسلمانوں کے دو سب سے بڑے حکمرانوں بلکہ اس دور کے سب سے بڑے فرمانروائے خلیفہ مامون الرشید (فرزند خلیفہ ہارون رشید) اور معتصم بن ہارون رشید کے مقابلہ میں صف آرا ہو جانا اور تازیانوں و زنداں کی تکلیف برداشت کرنا، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقیؒ (م ۱۰۳۴ھ) کا شہنشاہ اکبر کے عقیدۂ ہزارۂ دوم، دعوائے امامت و اجتہاد، اور وحدت ادیان کی مخالفت کرنا پھر جہانگیر کے عہد تک اس کو اس وقت تک جاری رکھنا جب تک کہ حکومت مغلیہ کا رخ بدل نہیں گیا،[1] اس کی دو مثالیں ہیں، ورنہ تاریخ اسلام اپنے اندر "کلمة حق عند سلطان جائر" اور "لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق" کی تابناک مثالیں رکھتی ہے، یہ سلطان جائر کبھی شخصی بادشاہ ہوتا ہے کبھی رائے عامہ، کبھی شہرت عام، کبھی دل فریب کامیابیاں اور بلند بانگ دعاوی، اور تاریخ و تجربہ شاہد ہے کہ آخر الذکر صورتیں زیادہ آزمائش کی چیزیں ہیں۔

حقیقت میں اسلام کی حقیقی تعلیم اور صحیح عقیدہ وہ دریا ہے جو کبھی اپنا رخ نہیں بدلتا، اور کبھی پایاب نہیں ہو سکتا، سیاسی طاقتیں، وقتی انقلابات، حکومتوں کا قیام و زوال، ورد عوتیں اور تحریکیں موجیں ہیں، جو آتی اور گزر جاتی ہیں، دریا اگر صحیح رخ پر بہہ رہا ہے اور آب جاری رہے تو کوئی خطرہ نہیں، لیکن اگر عقیدہ میں فساد آ گیا تو گویا دریا نے اپنا رخ بدل دیا، اس میں آب صافی کے بجائے گندلا اور ناصاف پانی بہنے لگا، اس لئے فساد عقیدہ

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت حصہ چہارم"

اور زیغ وضلال کے ساتھ کوئی دعوت و تحریک کسی ملک کا عروج و اقبال کسی معاشرہ کی جزئی اصلاح یا کسی فساد و خرابی کو دور کرنے کا دعویٰ یا وعدہ قبول نہیں کیا جا سکتا، یہ وہ حقیقت ہے جس میں اس ملت کی بقاء اور دین کی حفاظت کا راز مضمر ہے، اور یہی وہ حقیقت ہے، جو اپنے اپنے دور کے علماء و خادمین اور محافظین شریعت و سنّت کو اس دشوار اور بعض اوقات ناخوشگوار فرض کو ادا کرنے پر مجبور کرتی رہی ہے۔

سحر انگیزی کے نفسیاتی و سیاسی اسباب

آیت اللہ خمینی صاحب کی اس کامیابی سے جوان کو رضا شاہ پہلوی کی حکومت کے مقابلہ میں حاصل ہوئی اور اس انقلاب سے جو ایک مخصوص شکل میں ایران کے معاشرہ میں رونما ہوا، نیز بعض مرحلوں پر دنیا کی عظیم ترین طاقت امریکہ کی ناکامی، ایرانی نوجوانوں کے جذبۂ قربانی اور اسی کے ساتھ متعدد مسلم و عرب ممالک کی دینی و اخلاقی کمزوریوں و خامیوں اور وہاں کی ناپسندیدہ صورت حال سے برِ صغیر کے مسلمان نوجوانوں کے ایک بڑے حلقہ میں جو موجودہ حالات سے بیزار تھا، اور جو ہر اُس حوصلہ مندی اور مُہم جوئی سے مسحور ہوتا ہے جس میں اسلام کا نام شامل ہو جائے، خمینی صاحب اس طرح مقبول ہو رہے ہیں جیسے کسی زمانہ میں ہندوستان میں کمال اتاترک، اور عرب قوم پرستوں کے حلقہ میں جمال عبد الناصر تھے، اور اب بھی بعض حلقوں میں بعض ایسے سربراہان مملکت مقبول و محبوب ہیں، جو کھلے طریقہ پر منکرِ سنّت، حدیث کا مذاق اڑانے والے مغربی تہذیب کے رائج کرنے والے اور کمیونسٹ خیالات کے ہیں، مذہبی رنگ و آہنگ کے شامل ہو جانے کی وجہ سے خمینی صاحب ان سے زیادہ مقبول ہو رہے ہیں اور یہ بات اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ اگر کوئی عقیدہ کا سوال اٹھائے اور کتاب و سنت، اجماعِ امّت کے زاویۂ نگاہ سے بحث کرے اور اس معیار سے اس کو جانچنے کی کوشش کرے تو ان حضرات کے لئے اس کا سُننا بھی دشوار ہے اور ناپسندیدگی و برہمی اشتعال و ابتذال کی حد تک پہونچ جاتی ہے، یہ وہ صورت حال ہے جو اس دین کے مستقبل و روح اسلام کے نقطۂ نظر سے سخت تشویشناک ہے اور حضرت علیؓ کے اس بلیغ فقرہ کی تشریح و تصدیق "اتباع کل ناعق" (ہر زور سے بولنے والے کے پیچھے لگ جانے والا)

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝

(آل عمران ـ ۸)

نبیٔ رحمتؐ

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی

"سیرت نبویؐ پر یہ تازہ کتاب (نبی رحمتؐ) بعض حیثیتوں سے اپنی نوعیت میں منفرد ہے، اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تاریخ اور اسرار شریعت کو شاہ ولی اللہ دہلوی کے اسلوب میں مخلوط کر کے ایسے سائنٹفک اور منطقی انداز میں بیان کیا گیا ہے جسے پڑھ کر ایک غیر متعصب قاری کا دل خود بخود اس کی شہادت دے گا کہ جس ذات گرامی کی یہ سوانح حیات ہے وہ بے شبہ صرف ایک عظیم انسان نہیں بلکہ مرسل من اللہ اور مؤید من اللہ ہے۔

کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جو کچھ لکھا ہے اس میں مشرق و مغرب کی حالیہ تحقیقات سے خاطر خواہ استفادہ کیا گیا ہے ـــــ جن چیزوں سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے رسول برحق اور مؤید من اللہ کا ثبوت طبعی اور منطقی طور پر ہو رہا ہے ان کو جگہ جگہ نمایاں کیا گیا ہے، فاضل مصنف کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ سے علم کلام کا کام لیا ہے پوری کتاب "ما قل و دل" کی مصداق ہے، مولانا نے سیرت مقدسہ کی خاکہ نگاری اس دیدہ وری اور صداقت سے کی ہے کہ اسے پڑھ کر غیر شعوری اور نیم شعوری طور پر قاری کے ذہن میں سراج منیر اور نور مبین ہدایت کا نقش خود بخود اجاگر ہو جاتا ہے۔"

(ماخوذ از تبصرہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم۔ اے۔ رسالہ "برہان" دسمبر ۷۶ء)

آفسیٹ کی خوشنما طباعت اور اہم تاریخی مقامات کے نقشوں سے آراستہ ۵۹۵ صفحات قیمت اردو ایڈیشن /۵۰ روپئے
انگریزی ایڈیشن /۹۵ ،،

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ